محرم الحرام ۱۴۴۵ھ
اگست ۲۰۲۳ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام — خورشید انجم
- برِصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد اور احیائی فکر کا ارتقاء — قیصر جمال فیاضی

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل ● سفید کاغذ ● معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)
مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید
- قرآنی رسم الخط ● تفسیری سائز ● عمدہ سفید کاغذ ● مضبوط مراکو جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 72

شمارہ : 8

محرم الحرام 1445ھ

اگست 2023ء

فی شمارہ : 50روپے

سالانہ زرِتعاون: 500روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلسِ ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاھور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ، فون: 3-35869501
فیکس:35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور
رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ”دارُالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ53800) فون: 78-(042)35473375
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

پاکستان کی معاشی اور معاشرتی تباہی: ذمہ دار کون؟ ادارہ

بیانُ القرآن — 9

سورۃ القیامہ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ وتبصرہ — 20

بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام — خورشید انجم

گاھے گاھے باز خواں — 25

برصغیر پاک وہند میں اسلام کی آمد
اور احیائی فکر کا ارتقاء — قیصر جمال فیاضی

انوارِ ھدایت — 37

درود شریف: اہمیت اور فضائل — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

فکرونظر — 43

فسادِ بحر وبر: زوالِ آدمیت! — راحیل گوہر صدیقی

حُسنِ معاشرت — 53

حسد اور اس کا علاج — احمد علی محمودی

دعوتِ فکر — 67

دین کی دعوت اور سوشل میڈیا — مولانا عبدالمتین

سیرت وسوانح — 69

امام زمخشریؒ — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

پاکستان کی معاشی اور معاشرتی تباہی

ذِمّہ دار کون؟

پاکستان اور بھارت دونوں ایک ہی وقت میں اور تقریباً ایک جیسے حالات میں معرضِ وجود میں آئے تھے‘ لیکن معاشی استحکام کے اعتبار سے اس وقت دونوں ملکوں میں زمین آسمان کا فرق و تفاوت ہے۔ صرف جون ۲۰۲۳ء میں بھارت کی مجموعی برآمدات ۶۰ بلین ڈالر تھیں جبکہ دوسری طرف پاکستان اس قدر معاشی بدحالی کو پہنچ گیا ہے کہ آئی ایم ایف سے صرف تین ارب ڈالر قرض لینے کے لیے اس کی ہر شرط ماننے کو تیار تھا۔ ہماری معاشی بقا کا انحصار آئی ایم ایف سے ملنے والے قرض پر رہ گیا تھا اور اس کے علاوہ باقی کوئی راستہ ہی نہ بچا تھا۔ بھارت ۱۷ ارب ڈالر خرچ کر کے چاند پر مشن بھیج رہا ہے جبکہ ہم آئی ایم ایف سے صرف تین ارب ڈالر قرضہ ملنے پر خوشیاں منا رہے ہیں جو کہ ہمیں سود کے ساتھ واپس بھی کرنا ہے۔ اس قدر شرم ناک صورت حال کو ہم کیونکر پہنچے‘ اس پر گہرائی میں جا کر سوچنے اور تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک ایسا ملک جو ایک ایسے آفاقی نظریہ کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا جس نے مسلمانوں کو ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک دنیا میں بہترین سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی نظام کے ساتھ سپریم پاور کی حیثیت سے حکمرانی کرنے کا اہل بنایا‘ ایک ایسی قوم جو قرآن جیسی آفاقی کتاب کی حامل ہو‘ جس نے عرب کے صحرانشینوں کو اقوامِ عالَم کا امام بنا دیا وہ اس قدر ذلت اور پستی کا شکار کیونکر ہو سکتی ہے؟ ہمارا دعویٰ تھا کہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنائیں گے جبکہ آج صورتحال یہ ہے کہ ہم صرف چند ارب ڈالرز کی خاطر اپنے سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی نظام کو باطل قوتوں کے ہاں گروی رکھ چکے ہیں۔ ہماری اسمبلیاں خلافِ شریعت قانون سازیاں کر رہی ہیں۔ ہمارا تعلیمی نظام مکمل طور پر دجّالی تہذیب کے رنگ میں رنگ چکا ہے۔

سیکولر ذہنیت کے بعض لوگ اس تباہی اور خرابی کا ذمہ دار بھی اس نظریہ اور مذہبی نقطہ نظر کو قرار دے رہے ہیں کہ جس کی بنیاد پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ کہا جا رہا ہے کہ دنیا نے انجینئرز‘ ڈاکٹرز‘ سائنس دان‘ ریسرچرز‘ اکانومسٹ پیدا کیے جبکہ ہم نے نیلی‘ پیلی‘ کالی اور سفید پگڑیوں والے مولوی‘ ’’دہشت گرد‘‘ اور مناظر پیدا کیے۔ دنیا نے جدید سے جدید ٹیکنالوجی‘ انڈسٹری اور کارپوریٹ سیکٹر میں ترقی کی جبکہ ہم نے مدرسے اور مساجد کی تعداد میں اضافہ کیا۔ تاہم ہماری رائے میں یہ الزام ’’اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے‘‘ کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں ۷۵ سال سے پورے کا پورے نظام سیکولر طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ ملٹری اور سول بیوروکریسی میں اجارہ داری سیکولر طبقہ کی ہے۔ پورا معاشی نظام اور بینکنگ سسٹم اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر تباہی کا ذمہ دار وہ نظریہ اور وہ طبقہ کیسے ہو گیا جسے نظام کو مکمل طور پر کنٹرول میں لینے کا موقع ہی نہیں مل سکا؟ اس بہتان کا ردّ اوّل تو ایک نظری مثال ہی سے ہو جاتا ہے کہ امریکہ کو ناکوں چنے چبوانے کے بعد جب افغانستان میں افغان طالبان برسرِ اقتدار آئے تو پاکستان کا یہی سیکولر طبقہ ان کی اہلیت اور صلاحیت پر طرح طرح کے سوالات اُٹھا رہا تھا۔ آج وقت بتا رہا ہے کہ ان کی صرف دو سال کی کارکردگی ہماری ۷۵ سالہ کارکردگی سے بہتر ہے۔ آج وہاں ڈالر ۸۶ افغانی کا ہے جبکہ پاکستان میں ۲۸۴ روپے کا ہے۔ وہاں پٹرول ۶۵ افغانی فی لیٹر مل رہا ہے جبکہ پاکستان میں ۲۵۴ روپے میں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان ایک نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا جو کہ اسلام ہے۔ ۱۹۴۹ء میں اس نظریہ کے باقاعدہ نفاذ کے لیے ’’قراردادِ مقاصد‘‘ بھی پاس ہو گئی اور تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ علماء کے ۲۲ متفقہ نکات بھی سامنے آ گئے۔ لیکن پھر وہ اشرافیہ پاکستان پر قابض ہو گئی جس کی تخلیق اور تربیت باقاعدہ طور پر کالونیل اور پوسٹ کالونیل مقاصد کے تحت ہوئی تھی۔ چنانچہ جب قرارداد مقاصد پاس ہوئی تو اس اشرافیہ نے تاسف سے کہا تھا کہ: اب ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے! پھر جلد ہی اس اشرافیہ نے پاکستان کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے کر عالمی سامراج کے ایجنڈے کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ بہتر ہو گا کہ اس اشرافیہ کے فرائض‘ ذمہ داریوں اور اس کے مقاصد و عزائم کو سمجھنے کے لیے اس کے بیک گراؤنڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

عالمی سامراج نے اپنے ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کو ذریعہ بنایا۔ بظاہر تہذیب وترقی کے بلند و بالا دعووں کا دکھاوا کیا لیکن بباطن دُنیا کو معاشی‘ سیاسی اور معاشرتی طور پر اپنے پنجہ استبداد میں جکڑنا مقصود تھا۔ چنانچہ دنیا میں مختلف شکلوں کے کالونیل ازم کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جہاں تجارتی معاہدے کیے وہاں خام مال کی لوٹ کھسوٹ کے لیے غداروں‘ ٹھگوں اور ڈاکوؤں کی کھیپ بھی تیار کرنا شروع کی۔ اس کام کے لیے کمپنی انہیں اسلحہ‘ تربیت‘ سکیورٹی اور اہم معلومات دے رہی تھی۔ پھر غداروں کی اسی فوج کو استعمال کر کے کمپنی نے ہندوستانی علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ جو جو علاقے کمپنی کے قبضے میں آتے گئے وہاں اس نے اپنے وفاداروں کو بسانا شروع کیا۔ جو جتنا بڑا غدار‘ وطن فروش اور مخبر تھا اسے اتنا ہی بڑا خطاب‘ جاگیریں اور مراعات دی گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فرنگی انہی غداروں کی مدد سے یہ جنگ جیتنے اور عوام کو غلام بنانے میں کامیاب ہوگیا۔

اس کے بعد یہی طبقہ آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی زمینوں‘ روزگار‘ تجارت اور زراعت پر قابض ہوگیا۔ ان غاصبوں‘ وطن فروشوں اور ایمان فروشوں کے تحفظ کے لیے سکیورٹی ادارے اور عدالتی نظام ترتیب دیا گیا۔ سرکاری سرپرستی اور تحفظ میں رفتہ رفتہ ایک ایسی اشرافیہ وجود میں آگئی جس کا اولین مقصد عالمی سامراجی نظام کے ایجنڈے اور اس کی تہذیب کو تحفظ دینا تھا۔ چنانچہ اسی نے یہ یقینی بنایا کہ مقامی صنعت وحرفت بالکل تباہ ہوجائے تاکہ عالمی آقاؤں کی مصنوعات کو مارکیٹ میں جگہ مل سکے۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مقامی دست کاروں اور ہنرمندوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ ان کے ہاتھ اور انگوٹھے تک کاٹے گئے۔ طبقہ اشرافیہ میں ولایتی مصنوعات اور اشیاء کا استعمال ایک مقبول ٹرینڈ بن گیا۔ اصل مقصود بیرونی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے ولایتی مصنوعات کو رواج دینا تھا۔ آزادی کا مرحلہ آنے تک یہ اشرافیہ جاگیردار اور سرمایہ دار بن چکی تھی۔ کانگریس نے اعلان کر رکھا تھا کہ تقسیم کے بعد بھارت میں جاگیرداری سسٹم ختم کر دیا جائے گا‘ لہٰذا اس اشرافیہ کے مسلم جاگیردار فوراً مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوگئے۔ آزادی کے بعد سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ گٹھ جوڑ سے انہوں نے اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔ چنانچہ یہ آج بھی مغربی تہذیب اور نظام کے محافظ ہیں۔ یہی لوگ اسمبلیوں میں خلافِ اسلام قانون سازیاں کرتے ہیں‘ ملک سے سرمایہ لوٹ کر بیرونِ ملک

انویسٹ کرتے ہیں۔ ان کے پالتو گھوڑوں اور کُتوں کی خوراکیں بھی ولایت سے آتی ہیں۔ علاج معالجے باہر ہوتے ہیں۔ ملکی مصنوعات کے استعمال کو یہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اشرافیہ کے اسی طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ آج ملک اس حال کو پہنچا ہے۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے لیکن اس کے باوجود گندم‘ سبزیاں اور دیگر اجناس باہر سے منگواتا ہے۔ ٹیکسٹائل شعبہ میں پاکستان کثیر زرمبادلہ کما سکتا ہے مگر کپڑے کی برآمد میں مسلسل کمی ہورہی ہے۔ چائے کی پیداوار کے لیے پاکستان میں بہترین موسم اور وسائل موجود ہیں لیکن اس کے باوجود ۲۰۲۰ء میں پاکستان دنیا کا سب سے بڑا چائے درآمد کرنے والا ملک تھا۔ لائیوسٹاک کے شعبہ میں معمولی توجہ کے ساتھ سالانہ اربوں ڈالرز کا زرمبادلہ کمایا جاسکتا ہے لیکن اس طرف توجہ نہیں دی جارہی۔ وہ چیزیں جن کی پیداوار بڑی آسانی سے پاکستان میں ممکن بنائی جاسکتی ہے‘ وہ بھی باہر سے منگوائی جارہی ہیں۔ یہاں تک کہ پاکستان بچوں کے پیمپر بھی چین سے جبکہ جھاڑو انڈونیشیا سے درآمد کر رہا ہے۔

موبائل چارجز‘ کیبلز اور دیگر الیکٹرانک مصنوعات کی گھریلو سطح پر چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں لگا کر بھارت سالانہ اربوں ڈالر کما رہا ہے۔ بھارت کا ۲۰۲۵-۲۶ء کا الیکٹرانک مینوفیکچرنگ صنعت میں منافع کا تخمینہ تین سو ارب ڈالرز ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ہم صرف تین ارب ڈالر سودی قرض ملنے پر خوشیاں منا رہے ہیں‘ جبکہ صرف اپریل ۲۰۲۳ء میں بھارت کی مجموعی برآمدات کا حجم ۶۵.۰۲ ارب ڈالرز تھا۔ وہ کھربوں روپے جو ہمارے سیاست دان‘ بیوروکریٹس اور جرنیل بیرون ممالک آف شور کمپنیاں بنانے اور جزیرے خریدنے پر صرف کرتے ہیں‘ اگر اپنے ملک کی صنعت میں انویسٹ کریں تو یہاں کروڑوں لوگوں کو روزگار بھی مل جائے‘ غربت اور معاشی بدحالی بھی ختم ہو جائے اور پاکستان سالانہ کئی بلین ڈالرز زرمبادلہ کما کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوجائے۔ لیکن پاکستان پر قابض اشرافیہ عالمی سامراج کی وفادار تھی‘ اور اب بھی اسی کے ایجنڈے کو کندھا دیے ہوئے ہے۔ جب تک اس اشرافیہ کی اصلیت عوام کے سامنے نہیں آجاتی اور وہ عالمی سامراج کی بالواسطہ غلامی کے اس طوق سے وطن کو آزاد نہیں کراتے اس وقت تک نہ تو پاکستان میں خوش حالی آئے گی‘ نہ پاکستان کی معاشی‘ معاشرتی اور سیاسی آزادی یقینی ہو سکے گی اور نہ ہی نظریہ پاکستان پر عمل درآمد ہو سکے گا۔ ❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃِ

تمہیدی کلمات

سورتوں کے نظم کے اعتبار سے سورۃ القیامہ کا جوڑے کا تعلق سورۃ الدھر کے ساتھ ہے۔

سورۃ القیامہ ادبی ولسانی محاسن اور زورِ خطابت کے اعتبار سے قرآن کے عمومی اسلوب کی بھرپور نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ قرآن کا عمومی اسلوب دراصل خطابت کا اسلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت اپنی جگہ پر ایک خوبصورت خطبے کی حیثیت رکھتی ہے' بلکہ بعض سورتیں تو کئی کئی خطبات پر مشتمل ہیں۔ اس اعتبار سے ہم قرآن کو ''مجموعہ خطباتِ الٰہیہ'' (A Collection of Divine Orations) بھی کہہ سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے اس اسلوب کا رنگ حضور ﷺ کے خطبات میں بھی نظر آتا ہے۔ حضور ﷺ جب قرآن مجید پڑھ کر لوگوں کو سناتے تھے تو بھی آپ کا انداز خطیبانہ ہوتا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ خطبہ دیتے وقت آپ کی آواز بلند ہو جاتی تھی' آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں اور آپ کے اندازِ خطابت سے ایسے لگتا تھا جیسے کوئی سپہ سالار اپنے سپاہیوں کو للکار رہا ہے۔ بہرحال سورۃ القیامہ کی ایک ایک آیت میں خطابت کا بہت گہرا رنگ نظر آتا ہے۔

سورت کا آغاز اس انداز میں ہوتا ہے جیسے پس منظر میں کچھ لوگ وقوعِ قیامت کو جھٹلانے کے لیے دلیل بازی کر رہے ہوں اور یہ سورت ان کے سلسلۂ بحث کو منقطع کرتے ہوئے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہو۔ لیکن چند آیات کے بعد ابتدائی انداز اور خطاب کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ صوتی آہنگ اور خطاب کے رخ کی یہ تبدیلی (تحویلِ خطاب) سورت میں تقریباً ہر چار یا چھ آیات کے بعد ہوتی نظر آتی ہے۔ اس طرح پوری سورت چھوٹے چھوٹے کئی حصوں کا مجموعہ نظر آتی ہے جس میں ہر حصے کی آیات کا ردھم اور ہم آواز الفاظ سے پیدا ہونے والا صوتی آہنگ جدا

ہے۔ غرض یہ سورت زورِ خطابت' روانی' غنا' فصاحت و بلاغت اور بہت سی دوسری لسانی و ادبی خوبیوں کا مرقع ہے اور اس حیثیت سے یہ قرآن میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

آیات ۱ تا ۳۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ﴿۱﴾ وَ لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ﴿۲﴾
اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ﴿۳﴾ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ
نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ﴿۴﴾ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ ﴿۵﴾ یَسْـَٔلُ اَیَّانَ
یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿۷﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿۸﴾ وَجُمِعَ
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ کَلَّا
لَاوَزَرَ ﴿۱۱﴾ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ
بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ﴿۱۴﴾ وَّ لَوْ
اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ﴿۱۵﴾ لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَیْنَا
جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا
بَیَانَہٗ ﴿۱۹﴾ کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ ﴿۲۱﴾
وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ﴿۲۳﴾ وَ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ
بَاسِرَۃٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ ﴿۲۵﴾ کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ
التَّرَاقِیَ ﴿۲۶﴾ وَ قِیْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّ ظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ
السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾

آیت ۱ ﴿لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ﴿۱﴾﴾ ''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔''

لَا یہاں پر معترضین کے دلائل کی نفی کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ کہ تمہیں تو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ناممکن نظر آ رہا ہے اور اس بنیاد پر تم لوگ وقوعِ قیامت کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہو' مگر مجھے اس کے وقوع کے بارے میں اس قدر یقین ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ موقف کے مؤکّد اور مؤقّر ہونے کے اعتبار سے یہ آیت سورۃ التغابن کی اس

آیت سے گہری مشابہت رکھتی ہے: ﴿قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ﴾ (آیت ۷) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے رب کی قسم ہے تم لازماً اٹھائے جاؤ گے' پھر تمہیں لازماً جتا دیا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو تم نے کیے ہیں''۔ سورۃ التغابن کی اس آیت کا اسلوب اور انداز بہت پُر زور ہے' لیکن دیکھا جائے تو اس میں خارجی دلیل اور منطق کوئی بھی نہیں۔ البتہ ایک شخص اپنے موقف کے حق میں اپنی شخصیت اور اپنے یقین کو دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ لیکن یہ شخصیت وہ ہے جس کے قول و کردار کی سچائی کو اپنے پرائے سب نے مثالی مانا ہے اور یہی اس قول کے سچا ہونے کی سب سے قوی دلیل ہے۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے معاملے میں بھی وقوعِ قیامت کے دعوے کی دلیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپؐ کی سیرت ہے۔

آیت ۲ ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۲﴾ ''اور نہیں! مَیں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوامہ کی۔''

نفسِ لوامہ کے لغوی معنی ہیں ملامت کرنے والا نفس۔ اس سے مراد انسان کا وہ نفس ہے جسے ہم عرفِ عام میں ضمیر (conscience) کہتے ہیں۔ اس آیت میں نفسِ لوامہ یا انسانی ضمیر کو قیامِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انسانی نفسِ لوامہ یا ضمیر ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی مسلمان' کافر یا دہریہ انکار نہیں کر سکتا۔ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے'' یا "My conscience is biting me" جیسے جملے دنیا بھر کے انسانوں کے ہاں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ اگر آپ کوئی غلط یا بُرا کام کریں تو اندر سے کوئی چیز کیوں بار بار آپ کے دل و دماغ میں چبھن پیدا کرتی ہے؟ اور بعض اوقات اس چبھن کے تسلسل و تکرار کی وجہ سے آپ کی نیند تک کیوں اُڑ جاتی ہے؟ اگر کوئی نیکی نیکی نہیں اور کوئی بُرائی بُرائی نہیں تو بُرے کام پر آپ کے اندر کی یہ چبھن یا خلش آخر آپ کو کیوں تنگ کرتی ہے؟ چنانچہ نیکی اور بدی کے الگ الگ وجود کا سب سے بڑا اور آفاقی سطح پر مسلّمہ ثبوت انسانی نفس کی ملامت یا ضمیر کی خلش ہے۔ اور اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانوں کے نیک اور بُرے اعمال کا حتمی اور قطعی نتیجہ نکلنا بھی ناگزیر ہے۔ دوسری طرف اس حوالے سے زمینی حقائق سب کے سامنے ہیں۔ یعنی دنیا میں ایسا کوئی حتمی اور قطعی نتیجہ نہ

تو نکلتا ہے اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ اس دلیل کی روشنی میں اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ہر انسان کو اس کے اچھے بُرے اعمال کی پوری پوری جزا یا سزا دینے کے لیے ایک دوسری دنیا یعنی آخرت کا وجود میں لایا جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ قیامت' آخرت یا بعث بعد الموت کی سب سے بڑی دلیل خود انسان کے اندر موجود ہے' اور وہ ہے انسان کا نفسِ لوامہ یا اس کا ضمیر۔

آیت ۳ ﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۳﴾ ''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے؟''

آیت ۴ ﴿بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۴﴾ ''کیوں نہیں! ہم تو پوری طرح قادر ہیں اس پر بھی کہ ہم اس کی ایک ایک پور درست کر دیں۔''

یہاں پر بَلٰی کے بعد لفظ کُنَّا محذوف ہے' گویا تقدیرِ عبارت یوں ہے: بَلٰی کُنَّا قٰدِرِیْنَ...

آیت ۵ ﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۵﴾ ''بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ فسق و فجور آگے بھی جاری رکھے۔''

انسانوں کے ہاں آخرت کے انکار کی سب سے بڑی اور اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نیکی و بدی اور جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر کے عیش و عشرت کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حرام خوریاں چھوڑ کر راہِ راست پر آنے کے مقابلے میں انہیں آخرت کا انکار کر دینا آسان محسوس ہوتا ہے۔ آخرت کے بارے میں انسان کا یہ رویہ ایسے ہی ہے جیسے بلّی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن جس طرح کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلّی اپنا فیصلہ نہیں بدلتی اسی طرح ان کے انکار کر دینے سے قیامت کے وقوع میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ وہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت کے طور پر اپنے معیّن وقت پر آ دھمکے گی۔

آیت ۶ ﴿يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۶﴾ ''وہ پوچھتا ہے: کب آئے گا قیامت کا دن؟''

مشرکینِ مکہ حضور ﷺ سے یہ سوال طنزیہ طور پر پوچھتے تھے' اسی لیے اس کا جواب بھی بہت تیکھے انداز میں دیا گیا ہے۔ سوال و جواب کا یہی انداز اور اسلوب سورۃ الذاریات کی ان آیات میں بھی پایا جاتا ہے: ﴿يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۱۲ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۱۳﴾ ''وہ پوچھتے ہیں کب آئے گا وہ جزا و سزا کا دن؟ جس دن یہ لوگ آگ پر سینکے

جائیں گے‘‘۔ مذکورہ سوال کا جواب بھی بالکل اسی انداز میں دیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

آیت ۷ ﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷﴾ ’’پس جب نگاہیں چندھیا جائیں گی۔‘‘

آیت ۸ ﴿وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸﴾ ’’اور چاند بے نور ہو جائے گا۔‘‘

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ چاند سورج کے اندر دھنس جائے گا۔

آیت ۹ ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹﴾ ’’اور سورج اور چاند یکجا کر دیے جائیں گے۔‘‘

اِس وقت سورج چاند سمیت تمام اجرام فلکی کششِ ثقل کے قانون کے تحت اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔ جب یہ نظام ڈھیلا پڑے گا تو تمام کُرّے آپس میں ٹکرا جائیں گے۔

آیت ۱۰ ﴿يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰﴾ ’’اُس دن انسان کہے گا: کہاں ہے کوئی بھاگ جانے کی جگہ؟‘‘

آیت ۱۱ ﴿كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱﴾ ’’(کہا جائے گا:) ہرگز نہیں‘ کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲﴾ ’’اس روز تمہارے ربّ ہی کے حضور میں جا کر کھڑے ہونا ہے۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳﴾ ’’جتلا دیا جائے گا انسان کو اُس دن جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہوگا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہوگا۔‘‘

تقدیم و تاخیر کے اس فلسفے کو یوں سمجھیں کہ ہمارے اچھے بُرے اعمال کے بدلے کا ایک حصّہ تو ہماری زندگیوں میں ہی آخرت کے لیے ہمارے اعمال نامے میں جمع (credit) ہوتا رہتا ہے‘ جبکہ ان اعمال کا ایک دوسرا حصّہ اچھے یا بُرے اثرات کی صورت میں اسی دنیا میں رہ جاتا ہے۔ یہ ’’اثرات‘‘ اس دنیا میں جب تک موجود رہتے ہیں‘ ان کے بدلے میں بھی ثواب یا گناہ متعلقہ شخص کے اعمال نامے میں متواتر شامل ہوتا رہتا ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو واضح طور پر بتا دیا جائے گا کہ تمہاری یہ نیکیاں یا بدیاں تو وہ ہیں جو تم نے براہِ راست خود اپنے لیے آگے بھیجی تھیں اور یہ ثواب یا وبال وہ ہے جو تمہارے اعمال کے پیچھے رہ جانے والے اثرات کی وجہ سے تمہارے حساب میں جمع ہوتا رہا۔

آیت ۱۴ ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾ ’’بلکہ انسان تو اپنے نفس کے احوال پر خود ہی خوب بصیرت رکھتا ہے۔‘‘

قیامت کے دن تو کسی کو بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہر انسان کو خود ہی معلوم ہوگا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ دنیا سے وہ کیا کچھ لے کر آیا ہے اور یہ کہ وہ کیسے سلوک کا مستحق ہے۔

آیت ۱۵ ﴿وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝۱۵﴾ ’’اور چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔‘‘

ظاہر ہے دنیا میں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چرب زبان شخص خود ساختہ عذر پیش کر کے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے وہ وقتی طور پر متعلقہ لوگوں کو مطمئن کر لے لیکن اس کا ضمیر اس کو مسلسل یاد دلاتا رہتا ہے کہ تم جھوٹے ہو۔

اب آئندہ آیات میں خطاب کا رخ حضور ﷺ کی طرف ہو گیا ہے اور ساتھ ہی کلام کا صوتی آہنگ بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ ان آیات کے آخر میں قُرْاٰنَهٗ ، بَيَانَهٗ جیسے الفاظ آ رہے ہیں۔ جیسے کہ آغاز میں ذکر ہوا تھا‘ یہ سورت اپنے اسلوب اور صوتی آہنگ کے اعتبار سے چھوٹے چھوٹے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر حصّے کی خوبصورتی اور انفرادیت آیات کے آخر میں آنے والے ہم آواز الفاظ کی وجہ سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً ابتدائی آیات کا اختتام قِيَامَه ، لَوَّامه ، عِظَامَه ، بَنَانَه ، اَمَامَه جیسے الفاظ پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد چند آیات کے آخر میں الْبَصَر ، القَمَر ، المَفَر ، وَزَر ، الْمُسْتَقَر جیسے الفاظ آئے۔ جبکہ گزشتہ دو آیات کے اختتامی الفاظ (بَصِيْرَة ، مَعَاذِيْرَه) آپس میں ہم آواز ہیں۔ صوتی آہنگ اور اسلوب کی یہ تبدیلی سورت کی آئندہ آیات میں بھی مسلسل نظر آئے گی۔

آیت ۱۶ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶﴾ ’’آپؐ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔‘‘

حضورِ اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ جونہی حضرت جبرائیلؑ وحی لے کر آتے آپؐ نئے کلام کو فوری طور پر یاد کرنے کی کوشش کرتے۔ اس پس منظر میں یہاں آپؐ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اس ضمن میں آپؐ فکر مند نہ ہوں:

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷﴾ ’’اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذِمّہ ہے۔‘‘

یعنی آپ ﷺ خاطر جمع رکھیں‘ قرآن مجید میں سے کوئی آیت یا کوئی لفظ آپؐ بھولیں گے نہیں۔ اس پورے کلام کی حفاظت اور ترتیب ہمارے ذِمّہ ہے۔

آیت ۱۸ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾﴾ ''پھر جب ہم اسے پڑھوا دیں تو آپؐ اس کی قراءت کی پیروی کیجیے۔''

اس میں ترتیبِ مصحف کی طرف اشارہ ہے' یعنی وہ ترتیب جس کے مطابق قرآن مجید کتابی صورت میں مرتّب کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے قرآن مجید کے نزول کی ترتیب اور تھی اور مصحف کی ترتیب اور ہے۔ لیکن اس حوالے سے یہ اہم نکتہ مدِّنظر رہنا چاہیے کہ ترتیبِ مصحف بھی توقیفی ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی طے ہوئی ہے' اور یہ کہ ہر وحی کے ساتھ نئے کلام کی ترتیب کا حکم بھی آتا تھا۔ یعنی ہر وحی میں نازل ہونے والی سورت یا آیات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح کیا جاتا تھا کہ پہلے سے نازل شدہ قرآن کے اندر ان کی جگہ کون سی ہوگی۔

آیت ۱۹ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾﴾ ''پھر ہمارے ہی ذِمّے ہے اس کو واضح کر دینا بھی۔''

قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق یہ بہت اہم وضاحت ہے۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصل پیغام کی تبیین وتفہیم بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذِمّہ لے رکھی ہے۔ عملی طور پر اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ قرآن حسبِ ضرورت خود ہی اپنے احکام کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں دو احکام کے بارے میں آیا ہے: يَسْتَفْتُوْنَكَ... (آیت ۱۲۷ اور آیت ۱۷۶) کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ لوگ آپ سے فلاں مسئلے کی وضاحت چاہتے ہیں' تو انہیں بتائیں کہ اگر انہیں اس بات کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی تو اللہ تعالیٰ اس معاملے کی مزید وضاحت کر دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنی احکام کی تبیین وتشریح خود قرآن نے بھی کی ہے اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام زبانِ رسالت سے بھی کرایا ہے۔ اس کی ضرورت اور اہمیت قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴) کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے یہ ذکر آپ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس کو واضح کر دیں لوگوں کے لیے کہ ان پر کیا کچھ نازل ہوا ہے۔ یعنی اگر قرآن کے سمجھنے میں لوگوں کو کہیں کوئی ابہام یا اشکال محسوس ہو تو آپؐ اس کی وضاحت کر دیا کریں اور اگر انہیں کہیں کوئی حکم اجمال کے پردے میں لپٹا نظر آئے تو آپؐ اس کی تفصیل بیان کر دیا کریں —— آئندہ آیات میں خطاب کا رخ اور کلام کا آہنگ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو رہا ہے۔

آیت ۲۰ ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾﴾ ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ

جلدی ملنے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبّت کرتے ہو۔''

آیت ۲۱ ﴿وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾﴾ ''اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

یہاں خطاب کا رخ کفّار کی طرف ہے۔ یعنی تمہارا اصل مرض ہی یہ ہے کہ تم لوگ ''حُبِّ عاجلہ'' میں مبتلا ہو' اپنی دنیا کی زندگی اور دنیا کے مال و اسباب سے محبّت کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں آخرت کو بالکل ہی نظرانداز کیے ہوئے ہو۔

آیت ۲۲ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾﴾ ''بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے۔''

ان آیات میں اب میدانِ محشر میں موجود لوگوں کی کیفیت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ اس نقشے کو دیکھنے سے یوں لگتا ہے کہ ہر انسان کو اپنے اعمال کے مطابق اپنے نتیجے کا پہلے سے ہی علم ہوگا۔ جیسے سکول میں اعلانِ نتائج کے موقع پر کچھ بچے پہلے سے مطمئن اور کچھ پہلے سے پریشان ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ہر بچہ اپنے بارے میں خوب جانتا ہے کہ اس نے امتحان میں کیا کچھ کیا تھا۔

آیت ۲۳ ﴿اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ ''اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

بعض مفسّرین نے اس آیت سے یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے۔ اس لیے کہ رؤیتِ باری تعالیٰ میدانِ حشر میں نہیں ہوگی' بلکہ اہلِ جنّت' جنّت میں داخلے کے بعد سب سے بڑی جس نعمت سے سرشار ہوں گے وہ دیدارِ الٰہی ہوگی۔ لیکن کچھ علماء کا خیال ہے اور میری رائے بھی یہی ہے کہ اہلِ ایمان کو میدانِ محشر میں بھی کسی نہ کسی درجے میں رؤیتِ باری تعالیٰ سے مشرف کیا جائے گا۔ سورۃ المُطَفِّفِيْن میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

آیت ۲۴ ﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۢ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾﴾ ''اور بہت سے چہرے اُس روز اُترے ہوئے ہوں گے۔''

آیت ۲۵ ﴿تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾﴾ ''ان کو یقین ہوگا کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے والا ہے۔''

اس کے بعد اب قیامتِ صُغریٰ یعنی انسان کی موت کے وقت کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔ قیامتِ کُبریٰ کا ذکر تو قبل ازیں ان آیات میں آ چکا ہے: ﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿٧﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿٨﴾...﴾ لیکن انفرادی سطح پر تو ہر انسان کی موت ہی اُس کی قیامت ہے۔ اسی لیے قیامتِ

کُبریٰ کے مقابلے میں ہر انسان کی موت کو اُس کی ''قیامتِ صُغریٰ'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر انسان کو اپنی 'قیامتِ صُغریٰ' کا تصوّر اپنے ذہن میں مستحضر رکھنا چاہیے۔

آیت ۲۶ ﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾﴾ ''ہرگز نہیں! جب کہ جان آ کر پھنس جاتی ہے ہنسلیوں میں۔''

آیت ۲۷ ﴿وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور کہا جاتا ہے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟''

یہ اس کیفیت کا نقشہ ہے جب بڑے بڑے ڈاکٹر جواب دے دیتے ہیں' حکماء و اطباء معذرت کر لیتے ہیں اور عزیز و اقارب کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ بس جی اب دعا کریں۔ اُس وقت بڑے سے بڑا عقلیت پسند شخص بھی چاہتا ہے کہ کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلا لیا جائے یا کسی تعویذ گنڈے والے کو پوچھ لیا جائے۔ شاید کہ ایسی کسی ترکیب سے اُس کا پیارا موت کے منہ میں جانے سے بچ جائے۔

آیت ۲۸ ﴿وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ اب جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔''

آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب اہل و عیال سے بچھڑنے اور بڑے ارمانوں سے بنائے ہوئے گھر اور مال و اسباب کو چھوڑنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے۔''

یہ عین جان کنی کے وقت کی اس کیفیت کا ذکر ہے جب جسم کے نچلے حصے سے انسان کی جان نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اُس وقت وہ ناقابلِ بیان کرب اور شدید تکلیف کی کیفیت میں ہوتا ہے۔

آیت ۳۰ ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِۨالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾﴾ ''اُس دن تو تیرے رب ہی کی طرف دھکیلے جانا ہے۔''

نوٹ کیجیے' گزشتہ آیات کے بعد ہم آواز الفاظ سے بننے والا مخصوص صوتی آہنگ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو رہا ہے۔

آیات ۳۱ تا ۴۰

فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى
اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ
يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ
الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

آیت ۳۱ ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾﴾ ''پس اُس نے نہ تو تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔''

آیت ۳۲ ﴿وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾﴾ ''بلکہ اُس نے جھٹلا دیا اور پیٹھ موڑ لی۔''

آیت ۳۳ ﴿ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾﴾ ''پھر چل دیا اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا۔''

ان آیات میں ایک شخص کی حق دشمنی' ڈھٹائی اور اکڑفوں کی لفظی تصویر دکھائی گئی ہے۔ یہ تصویر سردارانِ قریش میں سے کسی خاص شخص کی بھی ہو سکتی ہے اور مجموعی طور پر اُن کے عمومی کردار کی بھی۔ سردارانِ قریش کے اس رویے کی جھلک سورۂ صٓ کی اس آیت میں بھی دکھائی دیتی ہے:

﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ﴿۶﴾﴾ ''اور چل پڑے ان کے سردار (یہ کہتے ہوئے) کہ چلو جاؤ اور جمے رہو اپنے معبودوں پر' یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض پوشیدہ ہے۔''

آیت ۳۴ ﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾﴾ ''افسوس ہے تجھ پر' افسوس ہے!''

آیت ۳۵ ﴿ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾﴾ ''پھر افسوس ہے تجھ پر' افسوس ہے!''

آیت ۳۶ ﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾﴾ ''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟''

کیا یہ لوگ اپنی دنیوی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں؟ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا اور ان کا حساب کتاب نہیں ہوگا؟ اور انہیں ان کے کرتوتوں کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑے گا؟

آیت ۳۷ ﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾﴾ ''کیا وہ حقیر پانی کی ایک بوند نہیں تھا جو

(رحم مادر میں) ٹپکائی جاتی ہے؟''

آیت ۳۷ ﴿ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً﴾ ''پھر وہ ایک عَلَقہ بنا''

یعنی پانی کی اس بوند نے جونک جیسی شکل اختیار کر لی جو رحم مادر کی دیوار کے ساتھ چمٹی رہی۔

﴿فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾﴾ ''پھر اللہ نے اس کو بنایا اور اس کے اعضاء درست کیے۔''

اللہ تعالیٰ نے عَلَقہ کو گوشت کے لوتھڑے (مُضغہ) میں تبدیل کیا اور پھر اس کا جسم بنایا' جس میں آنکھیں' ناک' کان اور اپنی اپنی جگہ پر دوسرے تمام اعضاء بنا دیے۔ اور یہ سب کچھ ہوتا رہا: ﴿فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ (الزمر:۶) شکم مادر کے تین پردوں کے اندر۔

آیت ۳۹ ﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾﴾ ''پھر اسی سے اُس نے دو زوج بنائے' نر اور مادہ۔''

کسی کو اُس نے مرد بنا دیا اور کسی کو عورت۔

آیت ۴۰ ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾﴾ ''تو کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟''

کیا تم لوگ جانتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گندے پانی کی بوند سے پیدا کیا ہے؟ اولادِ آدمؑ میں سے افلاطون' بقراط اور سقراط کی تخلیق بھی اسی بوند سے ہوئی اور تمام انبیاء اور اولیاء اللہ بھی ایسے ہی پیدا ہوئے۔ حضرت آدمؑ و حواؑ کے بعد صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے استثناء کے علاوہ نسلِ انسانی کے تمام افراد اللہ تعالیٰ نے اسی طریقے سے پیدا کیے۔ ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ (قٓ:۱۵) ''تو کیا پہلی مرتبہ تم لوگوں کو پیدا کرنے کے بعد اب ہم عاجز آ گئے ہیں؟'' اے عقل کے اندھو! کیا تم یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو ذات پانی کی ایک بوند سے زندہ سلامت' خوبصورت' بہترین صلاحیتوں کے مالک انسان کو پیدا کر سکتی ہے' کیا وہ مُردہ انسانوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہو گی؟ اس آیت کا انداز چونکہ سوالیہ ہے اس لیے اسے سن کر یا پڑھ کر ہماری زبانوں پر بے ساختہ یہ الفاظ آ جانے چاہئیں: ''کیوں نہیں! اے ہمارے پروردگار! تیری ذات پاک ہے۔ ہم گواہ ہیں کہ تو مُردوں کو زندہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔''

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب اس آیت کو پڑھتے تو اس سوال کے جواب میں کبھی بَلٰی (کیوں نہیں!) اور کبھی سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ فَبَلٰی (پاک ہے تیری ذات' اے اللہ! کیوں نہیں!) جیسے الفاظ فرمایا کرتے تھے۔ ❀❀❀

بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام

خورشید انجم

اگست ہمارے لیے اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس مہینہ میں ہمیں آزادی نصیب ہوئی۔ ۱۴/اگست کی حیثیت' دوسری اقوام عالم کے برعکس' صرف یومِ آزادی ہی کی نہیں ہے بلکہ اس دن اسلام کے نام پر ایک مملکت وجود میں آئی تھی۔ اس موقع پر قوم کے رہنماؤں کی جانب سے روایتی قسم کے بیانات نشر کیے جاتے ہیں اور بلند بانگ دعاوی کیے جاتے ہیں لیکن زمینی حقائق ہمارا منہ چڑا رہے ہیں۔ آج پاکستان کے ساتھ خلوص و اخلاص رکھنے والا ہر شہری شدید ذہنی کرب و اذیت میں مبتلا ہے۔

پون صدی قبل ہم نے یہ ملک بڑی تمناؤں' آرزوؤں اور وعدوں کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ یہ دعا کی گئی تھی کہ: اے باری تعالیٰ! اگر تُو نے ہمیں ایک علیحدہ ملک عطا کر دیا تو ہم تیرے دین کا بول بالا کریں گے' تیرے دین کو قائم و نافذ کریں گے اور تیرے نبی ﷺ کی شریعت کا نفاذ کریں گے۔ ہمیں یہ خوف تھا کہ ہندو اکثریت میں ہے۔ سرمایہ' تعلیم' تنظیم غرض ہر لحاظ سے وہ مسلمانوں سے بہت آگے ہے جبکہ ہم ہر اعتبار سے بہت پیچھے۔ لہٰذا ہندو ہمیں دبا لے گا اور اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لے گا۔ بلاتشبیہ و بلاتمثیل وہی کیفیت تھی جس کا نقشہ سورۃ الانفال کی آیت ۲۶ میں کھینچا گیا ہے:

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾

''اور یاد کرو جبکہ تم تھوڑی تعداد میں تھے اور زمین میں دبا لیے گئے تھے' تمہیں اندیشہ تھا کہ لوگ تمہیں اُچک لے جائیں گے' تو اللہ نے تمہیں پناہ کی جگہ دے دی اور تمہاری مدد کی اپنی خاص نصرت سے اور تمہیں بہترین پاکیزہ رزق عطا کیا تاکہ تم شکر ادا کرو۔''

درحقیقت پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کے لیے صرف ایک علیحدہ ریاست کے حصول کا معاملہ نہ تھا بلکہ اس میں احیائے اسلام کا وہ جذبہ بھی شامل تھا جسے علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے تحریک پاکستان کا جزو بنایا۔ یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے وطنی قومیت کی نفی انتہائی زوردار انداز میں کی: ؎

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر ۱۹۳۰ء کے الٰہ آباد کے تاریخی خطبہ میں پاکستان کے قیام کی بشارت ان الفاظ میں دی:

''میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک علیحدہ مسلم ریاست کے بنانے کا مطالبہ کرتا ہوں''

اور ایک علیحدہ مملکت کا مقصد ان الفاظ میں واضح کیا:

''اسلام کے لیے یہ ایک موقع ہوگا کہ عرب ملوکیت کے تحت اس پر جو پردے پڑ گئے تھے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکے اور اپنے قوانین‘ تعلیمات اور ثقافت کو اپنی اصل روح کے ساتھ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکے۔''

اس طرح انہوں نے مسلمانوں کو مایوسی کے اندھیروں سے نکالا اور اسلام کے روشن مستقبل کے مبشر بن کر سامنے آئے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود　　پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو دیکھتی ہے‘ لب پہ آ سکتا نہیں　　محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

اسی مقصد کی خاطر علامہ اقبال نے قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ لندن میں ملاقاتیں کیں۔ ان کے دینی جذبہ کو بیدار کیا کہ آپ اسلام کے احیاء کی بات کریں‘ یہ چیز مسلمانوں کے جذبات میں گرمی اور حرارت پیدا کرے گی۔ یوں انہیں واپسی پر آمادہ کیا۔ نتیجتاً قائداعظم کے افکار میں تبدیلی آئی۔ ۱۹۳۴ء میں آپ واپس ہندوستان آئے اور آپ کو مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا۔

قائداعظم نے قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد میں بلا مبالغہ سو سے زائد تقاریر میں مسلسل

تکرار کے ساتھ صرف اسلام کی بات کی۔ مثلاً چند شہ سرخیاں درج ذیل ہیں:

- ▼ پاکستان کا آئین ۱۳۰۰ سال سے قرآن پاک کی صورت میں موجود ہے۔
- ▼ ۱۳ جنوری ۱۹۳۸ء: مسلم لیگ کا جھنڈا اسلام کا جھنڈا ہے۔
- ▼ ۲۲ نومبر ۱۹۳۸ء: اسلام کا قانون دنیا کا بہترین قانون ہے۔
- ▼ ۱۸/اپریل ۱۹۳۸ء: ملّتِ اسلامیہ عالمی ہے۔
- ▼ ۷/اگست ۱۹۳۸ء: میں اوّل و آخر مسلمان ہوں۔
- ▼ ۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء: انسان خلیفۃ اللہ ہے۔
- ▼ ۹ مارچ ۱۹۴۰ء: ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں۔
- ▼ ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء: میرا پیغام قرآن ہے۔

پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قائداعظم نے زندگی بھر ''سیکولرازم'' کے لفظ کا استعمال گوارا نہ کیا۔ گویا مسلمانوں کی قیادت کے نزدیک پاکستان کو معرضِ وجود میں لانے کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند اس خطہ میں ایک ایسا قطعہ زمین حاصل کر لیں جس میں وہ نہ صرف انفرادی سطح پر اسلامی طرزِ حیات اپنانے میں آزاد ہوں بلکہ اجتماعی سطح پر قرآن وسُنّت کی بالادستی کو تسلیم کر کے اسلام کے عادلانہ نظام کی عملی نظیر دنیا کو پیش کر سکیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ہجرت کا مقصد کیا تھا؟ لاکھوں جانوں کی قربانی کیوں دی گئی؟ ہزاروں مسلمان عورتوں کی عزتیں وعصمتیں کیوں گنوائی گئیں؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ!'' کے نعرے کی برکت تھی‘ جس نے پشاور تا راس کماری اور خیبر تا کراچی مختلف رنگ ونسل اور زبان بولنے والے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے منظم کر دیا۔ حال یہ ہو گیا کہ ہر مسلمان کی زبان پر یہ نعرہ تھا کہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!''

بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد بحیثیت مجموعی پوری قوم نے اور بالخصوص حکمران طبقہ نے اس نظریہ سے انحراف کیا جس کی بنیاد پر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ مملکتِ خداداد بے لنگر جہاز کی مانند حالات وحوادث کی لہروں کے رحم وکرم پر ہے۔ ع ''آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!''

اسلام اور نظریہ پاکستان تو بہت دور کی بات ہے‘ آج ہر شخص مادہ پرستی اور دولت پرستی کے شرک میں مبتلا ہے۔ اب تو پاکستان کی بقا بھی ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے۔ مرضِ نفاق کی تمام تر علامات یعنی کرپشن‘ جھوٹ‘ وعدہ خلافی اور خیانت ہمارے اندر موجود ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ مرض لاعلاج ہو چکا ہے‘ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہم پر رحم فرمائے! ستم بالائے ستم یہ کہ آزادی کی جو عظیم نعمت ہمیں ثلث صدی قبل حاصل ہوئی تھی وہ بھی بڑی تیزی سے ہمارے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ ہمارے حکمران اسے طشت میں رکھ کر ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف جیسے آقاؤں کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔ بچی کھچی آزادی کو بھی شدید خطرات لاحق ہیں‘ لیکن ہم ہیں کہ خوابِ غفلت میں مدہوش ہیں اور جاگنے کو تیار نہیں۔ ہمیں اپنی تباہی کا احساس تک نہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

اس کا حل ”علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی“ کے مصداق یہی ہے کہ مبشّرِ پاکستان علامہ اقبال اور معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے ارشادات کے مطابق اسلام کے نظامِ حریت واخوت ومساوات کو قائم ونافذ کیا جائے۔ جس نظریہ سے انحراف کیا گیا ہے اسی کی طرف دوبارہ رجوع کیا جائے۔ صرف اسی صورت میں پاکستان کی بقا اور اس کا تحفظ یقینی ہو سکے گا۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب تک ہم اسلام کے نظامِ عدل وقسط کو قائم نہیں کرتے‘ ہماری حالت کے سدھرنے کا بظاہر احوال کوئی امکان نہیں۔ اندریں حالات پاکستان کی بقا کے لیے حسبِ ذیل کام انتہائی ناگزیر اور فوری طور پر کرنے لازمی ہیں:

(i) ایک ایسا طاقتور جذبہ جو تمام حیوانی جبلتوں پر غالب آجائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لیے تن من دھن لگا دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کر دے۔ اس کا باعث صرف نبی اکرم ﷺ سے محبت کا جذبہ ہی ہو سکتا ہے۔ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کو قائم کرنے کا جذبہ‘ جیسا کہ ۱۹۷۷ء میں ”پاکستان قومی اتحاد“ کی تحریک کو ”تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ“ کا نام دینے کے بعد دیکھنے میں آیا تھا۔

(ii) ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک مضبوط ذہنی وفکری رشتے میں منسلک کر کے بنیانِ

مرصوص بنا دے۔ یہ تعلق رنگ‘ نسل‘ زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اس طرح قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے۔

(iii) ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی جو مرد اور عورت‘ فرد اور ریاست‘ سرمایہ اور محنت کے مابین انصاف‘ عدل وقسط اور تمام حقوق وفرائض کا ایک حسین توازن پیدا کر دے۔

اسی تناظر میں تنظیمِ اسلامی کے زیر اہتمام ۱۱/اگست ۲۰۲۳ء سے تین ہفتوں پر مشتمل ”بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام“ مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ اربابِ اقتدار‘ عمائدینِ اُمّت اور عوام الناس کو موجودہ مسائل کے واحد حل ”نفاذِ عدلِ اسلام“ کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔ حکمرانوں سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ نفاذِ دین کی طرف عملی پیش قدمی کریں۔ علماء کرام اور دینی زعماء سے گزارش ہے کہ نفاذِ اسلام کے متفقہ فریضہ کی ادائیگی کو ترجیح اول دینے کے لیے قوم کی رہنمائی کریں۔ دینی سیاسی جماعتوں سے التماس ہے کہ وہ نفاذِ اسلام کو ون پوائنٹ ایجنڈا بنا کر ایک بھرپور تحریک چلائیں۔ عوام الناس سے گزارش ہے کہ وہ محض آٹا‘ پانی‘ بجلی‘ گیس اور دیگر مسائل پر احتجاج کرنے کے ساتھ ساتھ نفاذِ شریعت کے لیے بھی اجتماعی جِدّوجُہد کا راستہ اپنائیں‘ کیونکہ اسی سے ہماری اُخروی نجات وابستہ ہے۔

اگر ہم اب بھی تحریکِ پاکستان کے دوران کیے گئے وعدوں کی تکمیل کر دیں اور ملک میں اسلام کے نظامِ عدل وقسط کو قائم ونافذ کر دیں تو یہ وطنِ عزیز بلاشبہ دورِ حاضر کی ایک مثالی اسلامی فلاحی ریاست بن جائے گا۔

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی!

آیئے بقائے پاکستان اور اسلام کے نظامِ عدل کو قائم کرنے کی جِدّوجُہد میں شریک ہو کر اپنی ذمہ داری ادا کریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری جِدّوجُہد کو کامیاب بنائے تاکہ پاکستان کو حقیقی آزادی حاصل ہو اور یہاں ہر طرح سے استحکام ہو۔ پاکستان کے عوام دنیا میں بھی ترقی کریں اور آخرت میں کامیابی سے بھی سرفراز ہوں۔ آمین یا ربّ العالمین!

❁❁❁

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد اور احیائی فکر کا ارتقاء

قیصر جمال فیاضی ☆

تاریخ ایک قوم کی یادداشت ہوتی ہے اور جو قوم اپنی یادداشت سے محروم ہو جائے وہ اپنا وجود بھی کھو دیتی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ دوسری قوموں سے مرعوب ہو کر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی درخشاں تاریخ کا مطالعہ کریں اور بقول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ’’پہاڑی کے چراغوں‘‘ سے روشنی مستعار لے کر مستقبل کے مراحل طے کریں۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کا پیغام سب سے پہلے پہلی صدی ہجری میں ان مقدس ہستیوں کے ذریعہ پہنچا جن کی تربیت دستِ نبوت ﷺ نے کی تھی۔ تاریخ کی مختلف کتب اور تذکروں کے مطابق پچیس صحابہ کرام ؓ سرزمین ہند میں اسلام کی دعوت پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ بدقسمتی سے اس دور میں اسلام کو یہاں قدم جمانے اور مستحکم ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد برصغیر میں مسلمان تین اطراف سے آئے۔ جنوبی ہند کے ساحلی علاقے سے زیادہ تر تاجر‘ علماء اور مبلغین آئے۔ سندھ کی طرف سے بھی پہلے پہل تاجر اور مبلغین حضرات ہی کی آمد ہوئی۔ بعد میں محمد بن قاسمؒ کو مظلوموں کی مدد کے لیے آنا پڑا۔ شمال میں افغانستان کے راستے فاتحین‘ علماء‘ فقہا‘ محدثین اور مشائخ کی آمد ہوئی۔

اس ابتدائی دور کے بعد برصغیر میں اسلام بادشاہوں کے ذریعہ سے پہنچا۔ ان ملوک میں اچھے بھی تھے اور برے بھی‘ نیک بھی اور ظالم بھی‘ مگر بنیادی طور پر ان کی حیثیت بادشاہوں کی تھی‘ داعی کی نہ تھی۔ ان کے پیشِ نظر بڑی حد تک اپنی سلطنت کو وسیع کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی حکمرانی

☆ معاون شعبہ تعلیم و تربیت‘ تنظیم اسلامی

کے ادوار میں اکثر اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے اسلام یہاں تک پہنچا مگر نظامِ حکومت مجموعی طور پر منہاجِ خلافتِ راشدہ پر قائم نہ ہو سکا۔

مسلمان حکمرانوں کے ساتھ جو فوجیں آئی تھیں‘ ان کے ذریعے سے بھی اسلام پھیلا۔ وہ لوگ یہاں آ کر بس گئے۔ انہوں نے ایک طرح سے تبلیغ کا کام انجام دیا اور لوگوں نے بھی مثبت اثر قبول کیا‘ مگر یہاں بھی وہی خامی تھی کہ ایمان کی وہ حرارت اور دین کا وہ مزاج اپنی معیاری شکل میں موجود نہ تھا جو ہمیں قرنِ اول میں داعیانِ حق کی زندگیوں میں اور ان کے معاشرے میں نظر آتا ہے۔

پھر شمال ہی کی طرف سے صوفیاء اور علماء آئے۔ ان کی کوششوں سے برصغیر کی ایک بڑی آبادی مسلمان ہوئی۔ ان اولیاء و صوفیاء نے جس بے نظیر استقلال اور شغف سے‘ مشقتیں برداشت کر کے دین پھیلایا وہ آج کے صوفیاء کرام میں مفقود ہے اور ان کے لیے ایک عمیق درسِ بصیرت رکھتا ہے۔ ان میں سب سے بڑے مبلغ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ تھے۔ ان کے بعد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ‘ فرید الدین شکر گنجؒ‘ نظام الدین محبوبِ الٰہی وغیرہ ؒ چند مشہور نام ہیں۔

جب فتنۂ تاتار نے ہلاکو خان کی قیادت میں بنو عباس کی حکومت کے فلک بوس قصر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو پورے وسطِ ایشیاء میں صرف صوفیائے اسلام ہی کی یہ روحانی قوت تھی جو اس کے مقابلے میں باقی رہ گئی تھی اور بالآخر اسی نے اسلام کے اس سب سے بڑے دشمن پر فتح حاصل کی۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ یہ زبردست قوت آج بالکل مضمحل ہو گئی ہے اور غیر اسلامی مفاسد سے مغلوب ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ بھی بظاہر یہی نظر آتی ہے کہ ان صوفیاء و اولیاء نے قرآن کی تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کے اذہان تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ ہی دین کے غلبہ کے لیے کوئی جِدّ و جُہد کی۔

اس کے بعد احیائے دین کا پرچم گیارہویں صدی ہجری کے مجدد شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانیؒ نے اٹھایا۔ انہوں نے عہدِ اکبری میں جو جو فتنے پیدا ہوئے اور جتنی بدعتیں رائج ہوئیں اور جس طرح اسلام کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی‘ ان سب کے خلاف جہاد کیا۔ بقول علامہ اقبال: ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

اسی زمانے میں شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی کوششیں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ شیخ وہ پہلے عالمِ دین ہیں جنہوں نے تصنیف وتدریس کے ذریعے سرزمین پاک وہند میں علمِ حدیث کی نشرواشاعت کی۔ ہندوستان میں علمِ حدیث کو جو ترقی حاصل ہوئی‘ اس کا اوّلین سہرا شیخ عبدالحقؒ ہی کے سر ہے۔

بعد ازاں ایک طویل پُرفتن دور کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دورِ حکومت میں تین بڑے اہم کام کیے:

۱) پورے ملک میں اسلام کے لیے ایک سازگار فضا بنادی۔ وہ تمام غلط کام جو کھلے عام ہو رہے تھے‘ ان کی حوصلہ شکنی کی اور بدعات کو بند کیا۔

۲) اسلامی قوانین کو مرتب و مدوّن کیا اور ان کو نافذ بھی کیا۔ ’’الفتاویٰ الھندیہ‘‘ (فتاویٰ عالمگیری) کی تدوین کی‘ جو آج بھی اسلامی قانون کا بہترین مجموعہ شمار کیا جاتا ہے۔

۳) ایک نئے نظامِ تعلیم کی داغ بیل بھی ڈالی تاکہ ایسے افراد تیار کیے جاسکیں جو ملک کے نظام کو چلانے کے قابل بن سکیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی وہ تمام اجتماعی‘ مذہبی‘ اخلاقی‘ سیاسی کمزوریاں اور خرابیاں پوری قوت سے مسلمانوں پر حاوی ہوگئیں جو گزشتہ صدیوں سے برگ و بار لا رہی تھیں۔

شاہ ولی اللہؒ کا دَور اُس زمانے پر مشتمل ہے جب اورنگ زیب کی اصلاحات خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ مرہٹے اور جاٹ عروج پکڑ رہے تھے۔ انگریز اپنے قدم جمانے کے ساتھ ساتھ اپنے اثرات مسلسل بڑھا رہا تھا۔ ان حالات میں شاہ صاحبؒ نے اسلامی احیاء کے کام کا آغاز کیا۔ بلا شبہ شاہ صاحب بارہویں صدی ہجری کے مجدد تھے۔ انہوں نے نہایت حکمت‘ دانش مندی اور حسنِ توازن کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۰۳ء میں ان کے انتقال کے بعد جو بھی اصلاحی تحریک ہندوستان میں اُٹھی‘ اس پر شاہ ولی اللہؒ کے فکر کی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس بات کی کوشش کی کہ اُمت دوبارہ قرآن وحدیث سے وابستہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ فرمایا اور علومِ حدیث کی ترویج کی۔

آپؒ نے احادیثِ نبوی ﷺ کے ذریعہ احکامِ دین کی حکمتوں بلکہ دین کے پرانے نظام کو واضح کیا۔ اسی خدمت کا یہ نتیجہ تھا کہ اس اُمت میں دوبارہ اپنی اصل بنیادوں سے استواری کی کیفیت پیدا ہوئی۔ تاریخ اسلام سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اس اُمت کو جن لوگوں نے ترقی وتعمیر کی راہوں پر گامزن کیا‘ وہ وہی افراد ہیں جنہوں نے اس اُمت کو قرآن وسُنّت کی طرف دعوت دی ہے‘ خواہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ہوں یا امام ابوحنیفہ‘ امام شافعی ہوں یا امام احمد بن حنبل‘ امام مالک ہوں یا امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ۔ اس حقیقت کو شاہ صاحب نے محسوس فرمایا اور ہندوستان کے تاریک حالات میں مسلمانوں کا ربط قرآن وحدیث کے ساتھ قائم کیا۔

شاہ صاحبؒ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ آپؒ نے زندگی کی تمام جہتوں کے لیے اسلام کی ہدایات کو واضح کیا۔ آپؒ کے پیشِ نظر زندگی کے پورے نظام کی اصلاح تھی‘ اس کے محض کسی ایک پہلو کی نہیں۔ انہوں نے ’’فَکّ کُلِّ نظام‘‘ کا انقلابی نعرہ دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ باطل اور فرسودہ نظام کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ اسلام کا عدل وقسط پر مبنی نظام عمل میں لایا جائے۔

شاہ صاحبؒ کا تیسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کے ہاں بڑا ہی اعتدال‘ بے مثال توازن اور حسین جامعیت ملتی ہے۔ جو تعلیمات پیش کیں‘ ان میں بھی ان سب کی روح کو سمو لیا۔

شاہ صاحبؒ کا چوتھا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جس علم الکلام کی بنیاد رکھی اس میں قرآن کے طرزِ استدلال کو بنیاد بنایا۔ وہ طریقہ اختیار کیا جو ہمیں مشکوٰۃ نبوت ﷺ سے ملتا ہے۔ دل میں اتر جانے والی باتیں‘ دماغ کو مطمئن کر دینے والا استدلال‘ روز مرہ کے حقائق سے استشہاد۔ نہ تو فلسفیانہ موشگافیاں ہیں اور نہ ہی لایعنی بحثیں۔ شاہ صاحبؒ دینی والٰہیاتی امور کے ساتھ ساتھ معاشی اور سماجی امور میں بھی درک رکھتے تھے۔ ان کے معاشی نظریات آج بھی اسی طرح قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہیں جیسے ان کے دور میں تھے۔

شاہ ولی اللہ محدثؒ کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو ازسرِنو قرآن حکیم کے علم وحکمت کی جانب منعطف کر دیا۔ ان مختلف النوع اور وسیع الاطراف مساعی میں ان کی اہم ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے ’’الفوز الکبیر فی اصول التفسیر‘‘ اور فارسی ترجمہ قرآن کے ذریعہ رجوع الی القرآن کے طویل المیعاد عمل کا آغاز کر دیا جو بیسوی صدی عیسوی میں اپنی پوری شدّت کو پہنچ گیا۔

اسلامی احیاء کی اس تحریک کو شاہ ولی اللہؒ کے بعد شاہ عبد العزیز دہلویؒ اور ان کے خانوادے کے دوسرے بزرگوں نے زندہ رکھا۔ اس دور میں ایک طرف برطانوی سامراج بڑھتا چلا آ رہا تھا' دوسری طرف پنجاب میں سکھا شاہی کا منظر تھا' تیسری جانب خود مسلمانوں میں ہندوانہ رسم و رواج اور بدعات کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں تیرہویں صدی ہجری کے مجدد سید احمد شہیدؒ اور ان کے دستِ راست شاہ اسماعیل شہیدؒ کی قیادت میں ''تحریک مجاہدین'' اٹھی۔

اس تحریک کا پہلا ہدف اصلاحِ عقائد' بدعات سے اجتناب اور ہندوانہ رسم و رواج سے مسلمانوں کو بچانا تھا۔ اس کے لیے سید احمد شہیدؒ نے احیائے سنّت کی ہمہ گیر مہم چلائی۔ اس کا دوسرا بڑا ہدف اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو سر بلند کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد پہلی مرتبہ لوگوں نے اس تحریک کی شکل میں دوبارہ دورِ صحابہ کی ایک جھلک دیکھ لی۔ اگرچہ دُنیاوی اعتبار سے یہ تحریک ہمیں ناکام نظر آتی ہے مگر درحقیقت بعد میں آنے والی تحریکوں اور اصحابِ عزیمت کے لیے اس میں رہنمائی موجود ہے۔ اسی تحریک کے اثرات تھے جن کی وجہ سے کم از کم مسلمانوں کو انگریزوں سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہ کیا جا سکا۔

اسی زمانہ میں بنگال میں ایک اور بڑی نمایاں تحریک ''فرائضی تحریک'' بھی اُٹھی جس کی دعوت' خدمات اور اثرات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہؒ کے بھی تقریباً وہی اہداف تھے جو سید احمد شہیدؒ کے پیش نظر تھے۔ انہوں نے ''پیر اور مرید'' کا انداز اختیار کرنے کے بجائے ''استاد اور شاگرد'' کی اصطلاح اختیار کی اور ''الارضُ لِلّٰہ'' کا نعرہ لگایا۔ حاجی شریعت اللہؒ کے بعد ان کے صاحب زادے محسن میاںؒ عرف دودھو میاں نے تحریک کی قیادت سنبھالی۔ انہوں نے عملاً انگریزوں کے خلاف بغاوت بھی کی اور اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ اسی طرح بنگال میں ایک اور سرفروش سید میر نثار علیؒ المعروف تیتو میر نے بھی انقلابی تحریک شروع کی اور بالآخر انگریزوں کے خلاف ایک معرکہ میں شہید ہو گئے۔

اس کے بعد اب ہمارے سامنے ۱۸۵۷ء کا معرکہ آتا ہے' جسے انگریز ''غدر'' (بغاوت) کا نام دیتے ہیں۔ انگریزی جبر کے زمانے میں سرسید نے لکھا: ''غدر کیا تھا؟ ہندوؤں نے شروع کیا' مسلمان دِل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہو گئے۔ لیکن

مسلمانوں کے تمام خاندان برباد ہو گئے۔'' مگر حقائق و شواہد بتاتے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ بغاوت مسلمانوں ہی کی برپا کردہ تھی۔ اس بغاوت کی تنظیم اور تحرک میں سب سے زیادہ حصہ علماء نے لیا تھا۔ دراصل یہ معرکہ بھی سید احمد شہیدؒ کی تحریک ہی کا ایک فکری اور عملی مظہر تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج کے نوجوان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی سنگینی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تو ایک قیامت تھی جو ہندوستانی مسلمانوں کے سر پر سے گزر گئی۔

''قیصر التواریخ'' (کمال الدین لکھنوی) کے مطابق سات ہزار مسلمان معززین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ میتوں کو لے جانے والی گاڑیاں تین ماہ تک طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک لاشوں کو درختوں سے اتارتی رہیں۔ پھر ہزاروں علماء' فضلاء' فقہاء' شرفاء اور امراء کو عمر قید کے لیے جزائر انڈیمان (کالے پانی) بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں لارڈ ہارڈنگ نے حکم نامہ جاری کیا کہ آئندہ عربی' فارسی جاننے والے کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جائے گا۔ ۱۸۴۹ء تک پنجاب کی سرکاری زبان فارسی تھی مگر اس کا خاتمہ کر کے ۱۸۷۶ء سے پنجاب میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔

اس کے بعد ہم جس دور میں داخل ہوئے وہ ردِّعمل اور انحراف کا دور ہے۔ یہ تقریباً پچاس ساٹھ سال پر حاوی ہے۔ اس زمانے میں تین اہم ردِّعمل ہمارے سامنے آتے ہیں:

- سرسید احمد خان اور ان کی قیادت میں رونما ہونے والی علی گڑھ تحریک
- دیوبندی اور قدامت پسند علماء کا ردِّعمل
- مرزا غلام احمد قادیانی اور قادیانیت

دراصل بحیثیت مجموعی مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں ناکامی کے بعد مایوسی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ مسلمانوں نے اس وقت تک انگریز سامراج سے نجات حاصل کرنے کی تین کوششیں کی تھیں: بالاکوٹ جا کر لڑے' بنگال میں بغاوت کی اور ۱۸۵۷ء میں مختلف مقامات پر برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ لیکن تینوں کوششیں بظاہر ثمر آور ثابت نہ ہو سکیں۔ اس کے نتیجے میں فطری طور پر مسلمانوں میں بے بسی اور مایوسی رونما ہوئی اور مسکنت طاری ہو گئی۔

دوسری طرف انگریز نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ مسلمان تر نوالہ نہیں ہیں۔ ان میں کچھ تو لوہے کے ایسے چنے ہیں کہ ان کو چبانے کی کوشش میں دانت بھی ٹوٹ سکتے

ہیں۔ لہٰذا انگریزوں نے یہ پالیسی اپنائی کہ ان کو ختم کرنے کے لیے ہندوؤں سے تعاون کیا جائے۔ ان کے رہے سہے اقتدار کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس ہدف کو حاصل کرنے لیے مسلمانوں سے ان کی تمام مادّی قوتوں کو چھین لیا گیا۔ عام مسلمانوں کو روزگار سے محروم کردیا گیا۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کردیے گئے۔ اس کے مقابلے میں ضمیر فروشوں اور غداروں پر تمام عنایتیں نچھاور ہوئیں۔ انہیں بڑی بڑی جائیدادوں سے نوازا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں پر بھی عنایات ہوئیں اور انہیں احساس دلایا گیا کہ تم اکثریت میں ہو‘ لہٰذا آگے بڑھو۔

انگریز نے اسی پر ہی بس نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے ذہن مسموم بنانے کا بھی منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے ایک طرف تو عیسائیت کا وسیع پیمانے پر پرچار کیا گیا۔ عیسائی مشنریوں کی ایک فوج تھی جو ملک کے طول وعرض میں کام کر رہی تھی۔ ۵۳-۱۸۵۲ء میں برصغیر کے تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں صرف تیس ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے۔ اس کے برعکس ۱۸۵۷ء کے بعد عیسائی مشنری کالجوں میں تین لاکھ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ بظاہر تو یہ مشنری ادارے دنیاوی ترقی کا خواب دکھاتے مگر ان کا اصل ہدف دین کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا تھا۔

اس کے علاوہ انگریز نے ایک نیا نظامِ تعلیم متعارف کرایا جس کے بارے میں علّامہ اقبال نے کہا تھا ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف

معروف مستشرق ولیم میور (۱۸۱۹ء تا ۱۹۰۵ء) نے اپنی کتاب ’’دی لائف آف محمد (ﷺ)‘‘ (The Life of Mohammad) میں لکھا:

’’دنیا کو اسلام سے دو خطرے ہیں (نعوذ باللہ من ذالک)۔ ایک محمد (ﷺ) کی تلوار سے اور دوسرا محمد (ﷺ) کے قرآن سے‘ اور جب تک ہم دونوں کو ختم نہیں کر دیں گے‘ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔‘‘

اس پس منظر میں دو تحریکات اُبھریں: پہلی تحریک کی سربراہی سرسید احمد خان اور دوسری کی سربراہی علمائے دیوبند نے کی۔

سرسید احمد خان کی فکر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے بارے میں ان کی تشخیص یہ تھی:

◀ مسلمانوں کی ترقی کا راز اس میں ہے کہ برطانوی حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا جائے۔ ان سے اپنے تعلقات استوار کیے جائیں۔ ان کے ساتھ اٹھیں‘ بیٹھیں۔ ساتھ کھائیں اور پئیں تاکہ انگریز ان پر اعتماد کرنے لگے۔

◀ فکری اور تہذیبی میدان میں مسلمانوں کو جدید مغربی تہذیب سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔

◀ مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کر کے حکومت کے مناصب حاصل کرنے چاہئیں اور سرکاری ملازمتیں اختیار کر کے اپنی معاشی حالت درست کرنی چاہیے۔

سرسید نے اپنی فکر اور فلسفہ کی وضاحت کے لیے درج ذیل اقدامات کیے:

◀ سب سے پہلے بائبل کی تفسیر لکھی۔ بائبل کو غیر محرف اور الہامی مان کر اس سے اسلامی تعلیمات کی تائید میں استدلال کیا۔ یہ صرف بائبل کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پوری مغربی تہذیب اور انگریزوں کے ساتھ سمجھوتہ کی پہلی کوشش تھی۔

◀ رسالہ ’’طعامِ اہلِ کتاب‘‘ لکھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے خواہ اس پر کلمہ پڑھا گیا ہو یا نہیں۔

◀ مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اہلِ کتاب کے ساتھ کھائیں پئیں اور میز کرسی اور کانٹے چھری کا استعمال کریں۔

◀ ولیم میور کی کتاب ’’دی لائف آف محمد (ﷺ)‘‘ کے جواب میں ’’خطباتِ احمدیہ‘‘ اردو زبان میں لکھی۔ اس کا ترجمہ ان کے بیٹے سید محمود نے انگریزی میں کیا اور یہ کتاب ’’Essays on the Life of Mohammad PBUH‘‘ کے نام سے لندن سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ سے بے پناہ محبت نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں اہلِ مغرب کے اعتراضات کا رد تو کیا گیا ہے مگر ان بنیادی اُقدار کو تسلیم کر لیا گیا ہے جو مغربی تہذیب کی بنیاد ہیں۔

◀ قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے معجزات کا انکار کر دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ کے پیدا ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے اس معذرت خواہانہ انداز کو مسلمان

علماء نے ''نیچریت'' کہا۔ کچھ غلو کرنے والوں نے تو سرسید کو ''کرسٹان'' تک کہہ دیا۔

- ◀ سرسید احمد خان کا ایک اہم کام یہ تھا کہ انہوں نے اپنی ساری قوتیں مغربی نظام تعلیم رائج کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ علی گڑھ تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان تعلیم حاصل کر کے ہندوؤں کا مقابلہ کر سکیں، سرکاری ملازمتیں حاصل کر سکیں اور حکومت کا اعتماد حاصل کر لیں۔
- ◀ سرسید کی علی گڑھ تحریک کا بنیادی نقص یہ تھا کہ انہوں نے اسلام کو معیار بنا کر اصلاحی کام سرانجام نہیں دیا بلکہ کئی مواقع پر وہ اسلام کی قطع و برید کرنے کے لیے بھی تیار پائے گئے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ علماء نے جدید نظامِ تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ ان اعتراضات کے بارے میں بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ دراصل انہوں نے سرسید احمد خان کی تعلیم کی مخالفت کی تھی، بذاتِ خود تعلیم کی مخالفت نہیں کی تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سرسید کی تعلیمی تحریک سے بہت پہلے فتویٰ دے چکے تھے کہ مسلمان انگریزی زبان سیکھیں تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ اسلام کا دفاع کر سکیں۔ دراصل سرسید کی تحریک مغرب سے مرعوبیت کی تعلیم ہے۔ اس میں صاف کہا گیا تھا کہ ''تم کو داڑھی منڈوانا پڑیں گی، تم کو ہیٹ پہننا پڑیں گے، یہی راستہ ہے جس سے تم آگے بڑھ سکتے ہو۔'' اسی ذہنیت پر چوٹ کرتے ہوئے علامہ محمد اقبال نے کہا تھا کہ: ''مغرب کی ترقی کا راز نہ شیو کرنا ہے اور نہ ہیٹ پہننا، اس کا راز اس جذبہ اور ولولۂ قربانی میں ہے جس کا اس نے مظاہرہ کیا ہے اور جس سے آج ہم عاری ہو چکے ہیں۔''

بہرحال آخری عمر میں خود سرسید کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی سوچ غلط ہے۔ اپنے صاحب زادہ سید محمود کے بارے میں خود کہتے ہیں: ''میری توقع یہ تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے یہ اپنی قوتوں کو دین وملّت کی خدمت کے لیے استعمال کریں گے مگر انہیں ججی مل گئی اور انہوں نے اسے فوراً قبول کر لیا'' اس طرح ۱۸۹۰ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں: ''تعجب ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی فلاح کی امید ہوتی ہے، وہ خود شیطان اور مرتدین قوم ہوتے جاتے ہیں۔''

خواجہ الطاف حسین حالی ایک مخلص دوست کی طرح آخری دم تک سرسید کے ساتھ رہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنے مضمون ''چند ہم عصر'' میں لکھتے ہیں:

''حالی اپنی آخری عمر میں اس تعلیم سے شدید حد تک مایوس ہو گئے تھے اور کہتے تھے کہ

جو توقعات ہم نے علی گڑھ سے وابستہ کر رکھی تھیں، ان میں سے کوئی ایک بھی پوری نہیں ہوئی۔''

اس مایوسی کے بعد نواب وقار الملک نے ۱۹۱۳ء میں جامعہ ملّیہ کی تجویز پیش کی جسے ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر نے عملی جامہ پہنایا۔ اس تعلیمی تحریک پر اکبر الٰہ آبادی کا تبصرہ سنیے:

ابتدا کی جناب سید نے، جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونی ورسٹی پر ہوئی، قوم کا کام اب تمام ہوا

اس کے بعد علمائے کرام کا ردِعمل آتا ہے۔ فکری اعتبار سے اس کا سلسلہ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے وابستہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے آٹھ سال بعد اتر پردیش کے ضلع سہارن پور کے قصبہ دیوبند میں دینی وعربی علوم کی ترویج کی خاطر ایک دار العلوم کی بنیاد ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/ ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو چھتے کی پرانی مسجد کے صحن میں انار کے چھوٹے سے درخت کے سائے میں بڑی سادگی کے ساتھ دعا کرتے ہوئے رکھی گئی۔ علماء کا نظریہ یہ تھا کہ اگر ہم دین غالب نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کو بچا تو لیں۔ اس مدرسہ کو قائم کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ حکومت، اُمراء اور نوابوں کے آگے ہاتھ پھیلائے بغیر دین کی حفاظت کی ایک منظم کوشش کی جائے۔ محمود حسنؒ اس مدرسہ کے پہلے طالب علم تھے جو بعد میں شیخ الہند کہلائے۔ بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی رائے میں شیخ الہندؒ چودہویں صدی ہجری کے مجدد ہیں۔ امام الہند شاہ ولی اللہؒ کی جامعیت کا مظہر اگر ان کی تصانیف ہیں تو شیخ الہند کی جامعیت کا ظہور ان کے تلامذہ میں ہوا۔

دار العلوم دیوبند نے اُمت کی ایک عظیم خدمت انجام دی، وہ یہ کہ ہمیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلمہ پر قائم رکھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمارا تعلق قرآن اور حدیث سے قائم رہا۔ یہ درست ہے کہ ہم انگریز اور مغربی تہذیب سے ٹکر نہ لے سکے لیکن کم از کم اپنے ایمان، اپنی روایات، اپنی اقدار اور اپنے علوم کو تو ہم نے بچا لیا۔ یوں بعد میں اس بات کا امکان پیدا ہوا کہ اس بچے ہوئے سرمایہ کو لے کر اللہ کے کچھ دوسرے بندے آگے بڑھیں اور دین کے غلبہ کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے سیاسی طور پر پوری زندگی انگریزوں کے خلاف جدّوجُہد میں

گزار دی۔ اس کے لیے انہوں نے اسفار بھی کیے۔ جیل بھی گئے‘ قید و بند میں کوڑے بھی کھائے۔ غلبۂ دین کے لیے ’’ریشمی رومال‘‘ تحریک برپا کی‘ جس کا راز افشا ہونے پر انہیں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ مالٹا سے رہائی کے بعد اپنی زندگی کے آخری دور میں دارالعلوم دیوبند میں جملہ اکابر علماء کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

’’مَیں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس بات پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی و دُنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو اسباب معلوم ہوئے۔ ایک قرآن کو چھوڑ دینا اور دوسرے آپس کی تفرقہ بازی۔ اس لیے مَیں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی ماندہ زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی صورت برداشت نہ کیا جائے۔‘‘

مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے اپنی کتاب ’’وحدتِ اُمّت‘‘ میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ’’دراصل یہ جو تفرقہ بازی ہے اس کی بھی اصل وجہ قرآن کو چھوڑ دینا ہے۔ قرآن مجید تو کہتا ہے کہ ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا﴾ ’’اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو مل جل کر اور تفرقے میں نہ پڑو۔‘‘

بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۲۴ء تک پھیلے ہوئے دور کو ہم حرکت اور تجدید کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت مسلمانوں کا دوبارہ اپنے آپ کو اُمّتِ مُسلمہ کی حیثیت سے دریافت کرنا اور منوانا تھا۔ گویا یہ احیائے نو کی طرف پہلا قدم تھا۔

یہ دور مولانا الطاف حسین حالی (م: ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء) اور شبلی نعمانی (م: ۱۸ نومبر ۱۹۲۴ء) کی علمی و ادبی کاوشوں کی بنا پر رونما ہوا۔ حالی کی مسدس گھر گھر پہنچی جس نے مسلمانوں کے ذہنوں میں احساسِ زیاں پیدا کیا اور ان کے دل و دماغ میں مستقبل کی ایک روشن امید پیدا کی۔ شبلی نعمانی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کا رابطہ سیرت النبی ﷺ کے اخلاقی پہلوؤں سے جوڑا۔ مسلمانوں کو ان کی تابناک تاریخ سے روشناس کرایا اور سرسید کی جدید تعلیمی پالیسیوں پر شدید تنقید کی۔ اکبر الٰہ آبادی (م: ۵ فروری ۱۹۲۱ء) نے اپنے اشعار کے نشتروں سے مغربی تہذیب کے اثرات کو زائل کیا اور اسلامی تہذیب کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔

اس دور کی سب سے اہم پیش رفت ’’ندوۃ العلماء‘‘ کا قیام ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء ۲۶ ستمبر ۱۸۹۷ء کو لکھنؤ میں قائم ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ قدیم و جدید علوم کو ملایا جائے۔ ’’ندوہ‘‘ نے دینی لٹریچر کی فراہمی اور عربی زبان و ادب جیسی قیمتی خدمات انجام دیں مگر قدیم و جدید کو ملانے کا کام سرانجام نہ دے سکا اور نہ ہی ایسی انقلابی شخصیات تیار کر سکا جو قدیم و جدید کی صحیح معنوں میں جامع ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی قیادت ایسے جدید تعلیم یافتہ مسلم زادوں کے ہاتھوں میں آ گئی جو نواب زادوں اور بڑے بڑے زمینداروں کے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھی جسے ۱۸۵۷ء میں اپنی قوم سے بے وفائی کے بدلے میں انگریزی سامراج نے زمینوں‘ مناصب اور وسائل سے نوازا تھا۔ تاہم اس کمی کے باوجود ’’ندوۃ‘‘ اس دور کی بہت اہم اور مؤثر تحریک تھی۔ اس تحریک نے نئے دور کے تقاضوں کی نشاندہی کی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد رکھی جس نے بلند پایہ اہلِ قلم اور محققین کی ایک قابلِ قدر اجتماعیت تیار کی۔ اس ادارہ نے علمی و تحقیقی میدان میں ایک عظیم علمی اثاثہ مسلمانوں کے لیے تیار کیا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ (م: یکم مئی ۱۸۹۱ء)‘ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م: ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء)‘ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ (م: ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء) اور مولانا سید ناصر الدین ابو منصوریؒ نے ردّ عیسائیت کے سلسلے میں بڑی قیمتی خدمات انجام دیں۔ عیسائیوں اور آریہ سماجی ہندوؤں سے بڑے کامیاب مناظرے کیے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بین الاقوامی شہرت کے مناظر تھے جنہوں نے یورپ کے چوٹی کے پادریوں کو جگہ جگہ مدلّل اور مُسکت جواب دیے۔

درج بالا تمام قابلِ قدر حضرات کے علاوہ مزید بہت سی قابلِ ذکر شخصیات کا جگہ کی تنگی کی وجہ سے تذکرہ نہ ہو سکا۔ درحقیقت انہی حضراتِ گرامی کی مساعی سے احیاءِ اسلام کا اگلا دور شروع ہوا۔ بلاشبہ اس دور میں بھی بہت سی قدآور شخصیات نے احیائے اسلام کے لیے کام کیا۔

(جاری ہے)

❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

درود شریف: اہمیت اور فضائل

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

دنیا میں بہت سے مذاہب اور فلسفہ ہائے حیات پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ الہامی مذاہب جیسے یہودیت اور نصرانیت بھی موجود ہیں مگر ان میں تحریف ہو چکی ہے' جس کے باعث وہ اب قابلِ بھروسا نہیں رہے۔ ایسے مذاہب کے ہاں جامعیت نہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جن کے عقائد و رسوم سے طبیعت ابا کرتی ہے۔ اگرچہ تقریباً سب کے ہاں کسی مقتدر اعلیٰ ہستی (Supreme Being) کا تصور پایا جاتا ہے لیکن وہ مضحکہ خیز حد تک عجیب و غریب ہے۔ مثلاً بتوں اور دیگر اشیاء کو پوجنا وغیرہ۔ یہ امر کس قدر حیرت ناک ہے کہ انسان جو تمام مخلوقات میں افضل اور صاحبِ شعور ہے' کسی کمزور اور کم تر چیز کے سامنے جھکتا ہے اور اسے اپنا آخری سہارا سمجھتا ہے۔ درحقیقت اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے انسان کو ان سے کام لینا چاہیے نہ کہ ان کو اپنے نفع اور نقصان کا مالک سمجھا جائے۔

آج پوری دنیا میں صرف ایک طرزِ حیات ایسا ہے جو کامل ہے' ہر قسم کی کمزوریوں اور خامیوں سے پاک ہے اور وہ ہے اسلام۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام کا خالق وہ ہے جو عقلِ کُل ہے۔ تمام جاندار اور بے جان چیزیں اُسی نے پیدا کی ہیں۔ وہ انسان کی صلاحیتوں سے واقف ہے۔ اُس نے تمام مخلوق انسان کے لیے بنائی ہے۔ یہ انسان کی کم ظرفی ہے کہ وہ اپنے سے حقیر چیزوں کے سامنے جھکتا ہے۔

اسلام وہ ضابطہ حیات ہے جس کی تعلیمات میں کوئی خامی نہیں۔ یہ انسان کی ہر ضرورت کے لیے فطری راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور طرزِ زندگی میں ایسی جامعیت نہیں۔ اسلام خالقِ کائنات کا دیا ہوا راستہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے' جو عقل و فکر کے معیارات پر بھی پورا اترتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۣ﴾ (آل عمران:۱۹)

''بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام ہی واحد طرزِ حیات ہے۔''

انسان اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے' اس لیے فرمایا کہ جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور طرزِ زندگی اختیار کرے گا وہ سراسر خسارے میں ہوگا' کیونکہ انسان کے لیے واحد ضابطہ حیات بس اسلام ہی ہے۔ مزید ارشاد ہوا:

﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۚ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۸۵﴾﴾ (آل عمران)

''اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا' اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔''

جب اللہ کے ہاں دین صرف اسلام ہی ہے تو انسانوں کو اسی کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پہلے ان احکام پر خود عمل کیا اور پھر بنی نوعِ انسان تک ان کو پہنچایا۔ جنہوں نے ان احکام کو قبول کیا وہ اہلِ ایمان ٹھہرے اور جنہوں نے انکار کیا وہ کافر۔ آج دنیا میں جو مسلمان ہیں وہ نبی اکرم ﷺ کی وجہ سے صراطِ مستقیم پر ہیں۔ گویا رسولِ اکرم ﷺ محسن انسانیت اور خاص طور پر مسلمانوں کے لیے محسن اعظم ہیں۔ آپ ﷺ ہی کے طریقوں پر چل کر انسان آخرت کی زندگی میں کامیابی حاصل کر کے سدا بہار راحت پا لے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے احسانِ عظیم کا اعتراف کرتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں' جسے درود شریف کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۵۶﴾﴾ (الاحزاب)

''اے اہلِ ایمان! تم بھی ان پر خوب خوب درود اور سلام بھیجا کرو۔''

درود ایک طرح سے دعا ہے۔ انسان اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ یعنی ایک مسلمان خود تو رسول اللہ ﷺ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا البتہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتا ہے کہ وہ آپ ﷺ پر اپنی رحمتیں بھیجے۔ رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ بے حد وحساب مہربان ہے' ہمیں آپ ﷺ کے لیے دعا کرنے کا حکم

اس لیے دیا گیا ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کر سکیں۔ مسلمانوں کو چونکہ درود پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے اس کے پڑھنے والا اجر وثواب کا مستحق ہے‘ جو قیامت کے دن اس کی نجات کا باعث ہوگا۔ درود شریف کی فضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کو نماز کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ درود شریف نماز کے علاوہ بھی پڑھا جائے تو باعث ثواب اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ جب بھی آپ ﷺ کا نام نامی سنا جائے یا پڑھا جائے تو درود ضرور پڑھا جائے‘ کیونکہ جو شخص آپؐ کا نام سن کر درود نہ پڑھے اسے بخیل کہا گیا ہے۔ کثرت کے ساتھ درود پڑھنے والوں کو جنت میں رسول اللہ ﷺ کا قرب نصیب ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلَاۃً وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا)) (مسلم)

’’جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل کرتا ہے۔‘‘

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: ’’میرے پاس میرے رب کا پیغام آیا ہے کہ آپ کی اُمت میں سے جو شخص ایک دفعہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے دس نیکیاں لکھے گا‘ اُس کی دس برائیاں مٹا دے گا اور اُس کے دس درجے بلند کرے گا۔‘‘ (فضائل درود شریف‘ از محمد زکریا)

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَوْلَی النَّاسِ بِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَکْثَرُھُمْ عَلَیَّ صَلَاۃً)) (رواہ الترمذی) ’’بلاشبہ قیامت میں لوگوں میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب وہ شخص ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے‘‘۔ آپ ﷺ نے اس شخص کے عمل کو پسند فرمایا ہے جو کثرت کے ساتھ درود پڑھے۔

حضرت اُبی بن کعب ؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں آپ پر کثرت سے درود بھیجنا چاہتا ہوں تو اپنے اوقاتِ دُعا میں اس کی کتنی مقدار مقرر کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جتنا تمہارا جی چاہے!‘‘ میں نے عرض کیا: ایک چوتھائی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تمہیں اختیار ہے اور اگر اس کو بڑھا دو تو تمہارے لیے بہتر ہے‘‘۔ مَیں نے عرض کیا: نصف کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تمہیں اختیار ہے اور اگر بڑھا دو تو تمہارے لیے بہتر ہے‘‘۔ مَیں نے عرض کیا: دو تہائی کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’تمہیں اختیار ہے اور اگر اس سے بڑھا دو تو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے‘‘۔ مَیں نے عرض کیا: ’’یارسول اللہ ﷺ! پھر میں اپنے سارے

وقت کو آپؐ کے درود کے لیے مقرر کرتا ہوں‘‘۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’اس صورت میں تمہارے فکروں کی کفالت کی جائے گی اور تمہارے گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے‘‘۔ (ترمذی)

درود شریف ایسا وظیفہ ہے جس کی بار بار ترغیب دی گئی ہے تاکہ اس کے پڑھنے والا اعلیٰ درجات حاصل کر لے۔ حضرت ابودرداء ؓ نے حضور اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص صبح اور شام دس مرتبہ درود شریف پڑھے اس کو قیامت کے دن میری شفاعت پہنچ کر رہے گی۔ (رواہ الطبرانی) درود شریف بہت بڑا خزانہ ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے جبکہ اس کے پڑھنے والے کو رسول اللہ ﷺ نے شفاعت کی خوشخبری سنائی ہے۔ اس سے درود شریف کی فضیلت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حدیث میں درود شریف کے مختلف الفاظ مذکور ہیں‘ لیکن وہ الفاظ سب سے زیادہ فضیلت کے حامل ہیں جو نماز میں شامل کیے گئے ہیں۔ حضرت کعب بن عجرہ ؓ راوی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تو بتا دیا کہ ہم آپؐ کی خدمت میں سلام کس طرح عرض کیا کریں (یعنی تشہد میں اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ کہنا) اب آپؐ ہمیں یہ بتا دیجیے کہ آپؐ پر صلوٰۃ (درود) کیسے بھیجا کریں؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہا کرو:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ (رواہ البخاری و مسلم)

’’اے اللہ! اپنی خاص عنایت اور رحمت فرما حضرت محمدؐ پر اور حضرت محمدؐ کے گھر والوں پر‘ جیسے کہ تو نے عنایت و رحمت فرمائی حضرت ابراہیمؑ پر اور اُن کے گھر والوں پر۔ بے شک تو ہی حمد و ستائش کا سزاوار اور عظمت و بزرگی والا ہے۔ اے اللہ! خاص برکتیں نازل فرما حضرت محمدؐ پر اور حضرت محمدؐ کے گھر والوں پر‘ جیسے کہ تو نے خاص برکتیں نازل فرمائیں حضرت ابراہیمؑ پر اور حضرت ابراہیمؑ کے گھر والوں پر۔ بے شک تو ہی حمد و ستائش کا سزاوار اور عظمت و بزرگی والا ہے۔‘‘

واضح رہے کہ ’’آل‘‘ کے لفظ سے نبی اکرم ﷺ کے گھر والے یعنی ازواج و اولاد کے

علاوہ ایسے تمام لوگ مراد ہیں جو آپؐ کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہوں‘ خواہ یہ تعلق نسب اور رشتے کا ہو‘ رفاقت و معیت کا‘ عقیدت و محبت کا یا پھر اتباع و اطاعت کا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے لیے حمد وثنا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے لیے درود وسلام ہے۔ دعا کی قبولیت کے لیے درود شریف شرط ہے ورنہ وہ معلق رہتی ہے۔ نماز کے آخری تشہد میں دعا سے پہلے درود شریف پڑھا جاتا ہے جو دعا کی قبولیت کا سبب ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ بیان کرتے ہیں کہ جب تک تم اپنے نبی مکرم ﷺ پر درود نہ بھیجو‘ تمہاری دعا آسمان اور زمین کے درمیان موقوف رہتی ہے اور اس میں سے کوئی بھی چیز اوپر نہیں چڑھتی۔ (مشکوٰۃ) حضرت ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں: ’’جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگنے کا ارادہ کرے تو اس کو چاہیے کہ اللہ کی حمد وثنا کے ساتھ ابتدا کرے‘ پھر نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجے اور اس کے بعد دعا مانگے۔ پس اقرب یہ ہے کہ وہ کامیاب ہوگا اور اپنا مقصد پالے گا‘‘۔ ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ ؓ سے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں: ’’جو قوم کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں اللہ کا ذکر اور اس کے نبی ﷺ پر درود نہ ہو تو یہ مجلس ان پر قیامت کے دن ایک وبال ہوگی۔ پھر اللہ کو اختیار ہے کہ ان کو معاف کر دے یا عذاب دے‘‘۔ (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ’’جب تم اذان سنا کرو تو جو الفاظ مؤذن کہے وہی تم کہا کرو‘ اس کے بعد مجھ پر درود بھیجا کرو‘ اس لیے کہ جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلہ کی دعا کیا کرو۔ وسیلہ جنت کا ایک درجہ ہے جو صرف ایک ہی شخص کو ملے گا اور مجھے امید ہے وہ ایک شخص مَیں ہی ہوں۔ پس جو شخص میرے لیے اللہ سے وسیلہ کی دعا کرے گا اس پر میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔‘‘

وہ شخص بدنصیب ہے جس کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا نام پکارا جائے اور وہ آپؐ پر درود نہ پڑھے۔ حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ منبر کے ایک درجہ پر چڑھے اور فرمایا: آمین! پھر دوسرے درجہ پر چڑھ کر فرمایا: آمین! پھر تیسرے درجے پر چڑھ کر فرمایا: آمین! صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپؐ نے آمین کس بات پر فرمائی تھی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے تھے۔ انہوں نے کہا: خاک آلود ہو

اُس شخص کی ناک جس نے اپنے والدین یا ان میں سے ایک کا زمانہ پایا ہو اور انہوں نے اس کو جنت میں داخل نہ کروایا ہو۔ میں نے کہا: آمین! پھر انہوں نے کہا: خاک آلود ہو اس شخص کی ناک (یعنی ذلیل ہو) جس نے رمضان کا مہینہ پایا اور اس کی مغفرت نہ کی گئی ہو۔ تو میں نے کہا: آمین! اور پھر کہا: ذلیل ہو وہ شخص جس کے سامنے آپ ﷺ کا ذکر کیا جائے تو وہ آپؐ پر درود نہ بھیجے۔ میں نے کہا: آمین!‘‘ اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسے شخص پر ہلاکت کی دعا ہے اور شقاوت حاصل ہونے کی خبر ہے جس نے آپ ﷺ کا ذکر سنا اور درود نہ پڑھا۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ یہ بات ظلم ہے کہ کسی آدمی کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔ حضور اکرم ﷺ کو اپنا محسنِ اعظم جان کر درود پڑھنے میں کوتاہی کرنا بڑی بدنصیبی ہے۔

قرآن اور حدیث کی تعلیمات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثنا ضروری ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنا لازمی ہے۔ اس میں کوتاہی بدنصیبی ہے۔ درود ابراہیمی (جس کو نماز میں شامل کیا گیا ہے) کے علاوہ درود شریف کے مختلف الفاظ حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اس کے باوجود لوگوں نے خود سے کئی درود بنا لیے ہیں‘ جو سب غیر مسنون ہیں۔ بعض میں تو ایسے قابلِ اعتراض الفاظ بھی ہیں جو مستند اسلامی عقائد کے خلاف ہیں۔ ان کو اختیار کرنا گویا ایمان کو خطرے سے ڈالنا ہے۔ عقلِ سلیم کا تقاضا ہے کہ غیر مسنون کو چھوڑ کر مسنون درود ہی پڑھے جائیں جن کی فضیلت مسلّمہ ہے۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

فسادِ بحر و بر: زوالِ آدمیت!

راحیل گوہر صدیقی ☆

اس فانی دنیا کے آغاز ہی سے فسادِ بحر و بر کی ابتدا بھی ہوگئی تھی۔ دنیا کے پہلے انسان آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل میں حسد کی بنا پر ایک بھائی کے ہاتھوں دوسرے بھائی کا خون بہا‘ اور اس دن سے آج تک اللہ کی اس زمین کو انسانوں کے خون سے رنگا جا رہا ہے۔ احوال و ظروف سے اندازہ ہوتا ہے کہ قتل و غارت کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ ابلیس اپنے ہتھکنڈوں‘ اپنی مکاریوں اور فریب کاریوں سے انسانوں کو آگ اور خون میں نہلاتا رہے گا۔ کسی کو دولت و جائیداد اور کسی کو منصب واقتدار کا فریب دے کر‘ کسی کو حسن و جمال کی رعنائیوں میں مدہوش کر کے اور کسی کو اپنی طاقت اور اثر ورسوخ کے گھمنڈ میں مبتلا کر کے انسانیت کے اصولوں کو پامال کرواتا رہے گا۔ خود پسندی‘ خودنمائی‘ ظلم و نا انصافی‘ خاندانی تفاخر‘ بدگمانی‘ نسلی امتیاز‘ انا‘ بے حیائی‘ عریانیت اور نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر انسان اخلاق و پاکیزگی کو ملیامیٹ کرتے رہیں گے۔ یہ دنیا تباہی‘ بربادی‘ جسمانی اور روحانی کج روی کا شکار رہے گی۔ بے حسی‘ مفاد پرستی‘ اپنے خالق و مالک سے بے وفائی اور اس کی مخلوق سے بغض وعداوت کی یہ سفلانہ سوچ پروان چڑھتی رہے گی۔

بحر و بر میں فساد انسان کی بداعمالیوں ہی کا منطقی نتیجہ ہے‘ ورنہ دنیا کی ہر شے اپنی فطرت کے اعتبار سے توازن و اعتدال پر قائم ہے۔ یہ نعمت اللہ کی جانب سے ودیعت کی گئی ہے۔ امام راغب اصفہانی ’’مفردات القرآن‘‘ میں لفظ ظَھَرَ کا مفہوم بیان فرماتے ہیں کہ ’’اضافہ ہوا اور پھیل گیا‘‘۔ لفظ ’فساد‘ کی تشریح کرتے ہوئے امام صاحب لکھتے ہیں:

’’فساد خروج ہے حدِ اعتدال سے خواہ یہ خروج تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اور فساد مخالف ہے الصلاح کا۔ اس کا اطلاق ہر اس بات پر ہوتا ہے جس کا تعلق انسانی جان‘ بدن اور خارجی اشیا سے ہے۔ گویا ظَھَرَ الفساد سے مراد مخلوق کا فطرت‘ سُنّتِ الٰہی اور حدِ اعتدال سے انحراف اور باہر نکل جانا ہے۔‘‘

☆ معاون مسئول شعبہ تصنیف وتالیف‘ قرآن اکیڈمی‘ یٰسین آباد‘ کراچی
Email:raheelgoher5@gmail.com

انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں جو فساد برپا ہوتا ہے اسے قرآن حکیم میں ان الفاظ سے واضح کیا گیا ہے:

﴿وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا وَادۡعُوۡہُ خَوۡفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ (الاعراف)

’’اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد پیدا نہ کرو اور اللہ کو خوف اور امید سے پکارو‘ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔‘‘

فساد فی الارض کی ہلاکتیں دو اعتبارات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس روئے ارض پر نسلِ انسانی کی بقا کو ناقابلِ تلافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور دوسرے نسلِ انسانی فلاح اور کردار سازی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اندیشہ ہے کہ اگر انسانوں میں انتشار وافتراق اور فساد کی یہ روش برقرار رہی اور اس کے آگے کوئی بند نہ باندھا گیا تو اس طوفانی ریلے میں سب کچھ خس و خاشاک کی مانند بہ جائے گا۔ نسلِ انسانی کی بقا‘ تعمیر اور اس کی افزائش کے امکانات معدوم ہو جائیں گے‘ کیونکہ طوفان دریا کے کنارے پر بیٹھے ریت کے گھروندے بناتے معصوم بچوں کو بھی بہا لے جاتا ہے۔ اس حوالے سے دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اگر انسانوں کی موجودہ غیر فطری اور غیر مہذب طرزِ زندگی کو صحیح رخ پر نہیں ڈالا گیا تو آنے والے ماہ و سال میں سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی ہی نہیں‘ تہذیبی اور اخلاقی قدریں بھی دنیا کے جابروں اور فرعونوں کی غلام بن کر رہ جائیں گی۔ لالچ‘ خودغرضی‘ ھَلْ مِنْ مَّزِیْد اور شحِ نفس انسان کی عزّتِ نفس اور خودداری کو زمین بوس کر دیتی ہے۔

عالمی سطح پر بھی اس گمبھیر مسئلے کو بڑی سنجیدگی سے لیا گیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں امریکا کے صدر جمی کارٹر کی ہدایت پر ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے ۱۹۸۰ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں روئے ارضی پر نسلِ انسانی کی بقا کے تعلق سے کہا گیا:

‘‘If present trends continue , the world in 2000 will be more crowded, more polluted , less stable ecologically

and more vulnerable to disruption than the world we live in now."

''اگر حالیہ روش اسی طرح برقرار رہی تو ۲۰۰۰ء میں دنیا زیادہ پُر ہجوم' زیادہ آلودہ' ماحولیاتی اعتبار سے کم مستحکم اور بآسانی تباہ ہوجانے کے قابل ہوجائے گی اس دنیا کے مقابلے میں جس میں ہم ابھی سانس لے رہے ہیں۔''

روئے ارض پر انسانی فلاح (prosperity) کے تعلق سے یہ رپورٹ کہتی ہے:

"Though there would be greater material output including production of food, the World's people will be as poorer in many ways than they are today."

''اگرچہ (آئندہ صدی میں) زیادہ مادی پیداوار ہوگی بشمول غذائی پیداوار کے' دنیا کے لوگ مختلف اعتبارات سے زیادہ غریب ہوں گے جتنا کہ وہ آج ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا رپورٹ کے موافق آج یہ دنیا اپنی بقا اور فلاح دونوں اعتبارات سے وہیں پہنچ چکی ہے۔ آخر یہ ہوا کیسے؟ اس سلسلے میں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ایسا دین سے دُوری' توحید و رسالت سے انکار اور آخرت کے یقین میں شبہات پیدا کرنے کے باعث ہوا۔ جب حکمتِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنی عقل انسان کے فکر و عمل پر غالب آجاتی ہے اور وہ اپنی خواہشِ نفس کا غلام ہوجاتا ہے تو پھر وہ ہدایت کی راہیں خود اپنے لیے بند کر لیتا ہے۔

مَیں اپنی راہ میں دیوار بن کے بیٹھا ہوں
اگر وہ آیا تو کس راستے سے آئے گا!

اس سچائی کا اظہار مغرب کے حقیقت پسند دانشوروں نے بھی کیا ہے۔ اصل میں جب نظریہ حیات کی صحیح تعبیر کھو جائے تو پھر وہ ایک نہیں رہتی بلکہ بہت سی تعبیرات کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق ایک ہے جبکہ غیر حق کی بے شمار شکلیں ہیں' جس طرح نورِ ہدایت ازل سے ایک ہی ہے جبکہ ظلمات کی کئی شکلیں اور روپ ہیں۔ آج اسلام کے ساتھ یہی ماجرا پیش آیا ہے کہ اس کی صحیح تعبیر کھو دینے کے بعد ہم اس کی گوناگوں تعبیرات کر رہے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہوگیا ہے کہ اسلام کی صحیح تعبیر کون سی ہے اور کیوں ہے!

باطل مذہب جب اسلام کی مخالفت کرتا تھا تو ہماری غیرتِ دینی جوش میں آتی تھی۔ ہمارا جائز غصہ بھڑکتا تھا اور ہمارے دل میں اس کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت

اور محافظت کا جذبہ ابھرتا تھا۔ اب جب باطل فلسفۂ اسلام کی مخالفت کرتا ہے تو ہماری غیرتِ دینی کا جوش کم ہوتا ہے' ہمارا جائز غصہ بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور ہمارے دل میں اس کی جوابی مخالفت اور اس کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت اور حمایت کا جذبہ کمزور ہوتا ہے۔ جب ہم اس کے فریب میں پھنستے ہیں تو بے علمی اور جہالت قبول کرتے ہیں لیکن اسے علم کا نام دیتے ہیں۔ بے عقلی اور نادانی اختیار کرتے ہیں لیکن اسے عقل اور زیرکی سمجھتے ہیں۔ اپنے دشمن کو دوست سمجھتے ہیں اور اس سے تعاون بھی کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری بربادی کی جن کوششوں میں وہ مصروف ہے' ہمارے ہی ہاتھوں سے وہ زیادہ مؤثر اور زیادہ کامیاب ہوجاتا ہے۔ اسی اندوہناک حادثے نے ہمیں چاروں شانے چت کر دیا ہے۔

علامہ بیضاوی فرماتے ہیں:

''بحر و بر میں فساد کا ظہور مثلاً خشک سالی' بحری اور آبی اشیاء کی پیداوار میں کمی' برکتوں کا ختم ہوجانا' نقصانات کی کثرت' گمراہی اور ظلم کا بڑھ جانا..... یہ سب انسان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے جو اس کے گناہوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔''
(انوار التنزیل للبیضاوی 'ج ۳'ص ۱۶۱)

اسی ضمن میں علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

''جیسے خشک سالی' قحط' زراعتی پیداوار میں کمی' تجارتی منافعوں میں نقصانات' انسانوں اور مویشی کی اموات کا زیادہ واقع ہونا' آتش زنی اور غرقابی کی زیادتی' خشکی اور تری کے شکار اور دوسری پیداوار میں کمی اور نقصانات کا اضافہ۔'' (الکشاف' ج ۳' ص ۲۲۴)

یہ خرابیاں اور نقصانات اور ان کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتیں لازمی نتیجہ ہیں اللہ اور اس کے احکام کی اطاعت سے روگردانی کا۔ علامہ ابنِ کثیر فرماتے ہیں:

''زراعتی پیداوار اور پھلوں میں کمی گناہوں کے سبب ہوتی ہے' اس لیے کہ زمین اور آسمان کی صلاح اطاعتِ الٰہی پر موقوف ہے۔'' (مختصر ابن کثیر' ص ۵۷)

عقیدۂ توحید ایک ایسی متوازن شخصیت کی تشکیل کرتا ہے جس کی حیات کا رُخ ممتاز ہوتا ہے۔ اس کا مقصدِ زندگی ایک اور طرزِ زندگی متعین ہوتا ہے۔ اس کا ایک معبود ہوتا ہے جس کی طرف وہ خلوت و جلوت میں رجوع کرتا ہے۔ تنگی اور تکلیف میں وہ اسی کو پکارتا ہے۔ وہ چھوٹا یا بڑا جو بھی عمل انجام دیتا ہے وہ اُس معبودِ واحد کی رضامندی کا باعث ہوتا ہے۔ عقیدۂ توحید سے

دوری اور اپنے خودساختہ معبودوں کی پرستش ہی اصل میں تمام برائیوں‘ خرابیوں اور فتنہ وفساد کی جڑ اور بنیاد ہے۔

پھر یہ کہ اس دنیا میں رہنے‘ اس کو برتنے کے بھی کچھ اہم تقاضے ہیں‘ جنہیں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ اصول زندگی کی سمت کو درست رکھتے ہیں اور راستے ہموار ہو جاتے ہیں۔ احترامِ انسانیت کے تحفظ کو ملحوظِ خاطر رکھنا بھی انسانیت کے لیے راحت وسکون کا باعث ہے۔ اس میں اتحاد واتفاق کا فروغ‘ وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل ناگزیر ہے۔ اتحادِ عالم کا مکمل قیام اسی وقت ممکن ہے جبکہ ظاہری اور باطنی وحدت حاصل ہو۔ ذہنی وحدت ہی وہ مضبوط بنیاد ہے جس پر عالمی اتحاد کی پُرشکوہ عمارت اٹھائی جاسکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے کلمہ شہادت عطا کیا گیا اور ذہنی تربیت کے لیے مزید تفصیلات سے واقفیت بہم پہنچائی گئی تاکہ ذہن میں پریشان خیالی نہ رہے۔ یوں تمام افعال ایک ہی قوتِ عاملہ کے تحت تسلسل کے ساتھ ادا ہوتے رہیں۔ ایک آقا اور ایک قادرِ مطلق کے سوا ذہن میں کوئی تصور داخل ہی نہ ہونے پائے‘ ورنہ تخیل کی وحدت پراگندہ اور فکری جمعیت منتشر ہو جائے گی۔

کوئی تصویر نہ ابھری تری تصویر کے بعد
ذہن خالی ہی رہا کاسۂ سائل کی طرح

توحید انسانیت کا سنگِ بنیاد ہے۔ یہاں سب چیزیں انسانی فکر انگیزی کے لیے ہیں اور ان کا مخصوص وجود انسان کی خاطر ہے۔ شرک میں بدامنی کی عفونت پائی جاتی ہے۔ زنا کو بھی مشرکین کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ کسی کے حقوق کی پامالی ہوتی ہے اور پھر اتحاد کی فضا پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اسلام نے جہاں انفرادیت پر زور دیا ہے وہاں ملت یا معاشرہ کا پابند بھی ٹھہرایا ہے۔ اطاعتِ امیر اور پابندیٔ شریعت سے مسلمان ملت سے وابستہ رہ کر اس کے استحکام اور قوت کا باعث بنتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اگر تم پر کوئی ایسا حبشی غلام بھی جس کا سر منقی کی طرح چھوٹا ہو‘ امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ حکومت کتاب اللہ کے مطابق چلائے اس کی سمع وطاعت کرتے رہو۔“ (بخاری)

اسلام جب تک انسانوں کے فکر وعمل پر نافذ وغالب رہتا ہے‘ سارا انسانی معاشرہ پُرسکون اور مطمئن ہوتا ہے‘ لیکن جب وہ غالب و نافذ نہیں رہتا تو انسانی معاشرے میں توحید سے

انحراف اور خدا سے بغاوت کا چلن رواج پا جاتا ہے۔ بغاوت اور انحراف کی ایسی روش اس کائنات کے کسی اور گوشے‘ کسی اور مخلوق میں نہیں پائی جاتی۔ جب انسان اس صحیح ڈگر سے ہٹ کر اپنے لیے کوئی اور راہ منتخب کر لیتا ہے تو باہمی تصادم‘ حادثات وسانحات کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے۔ کائنات کی ہر اطاعت گزار مخلوق اس باغی وسرکش مخلوق سے ٹکراتی ہے اور یوں فتنہ وفساد کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ یہ فساد فی الارض دنیا کے باسیوں کی زندگیوں کو ناقابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔ انسانیت سسکنے لگتی ہے۔ جسم گھائل اور روح اپنی نورانیت سے محروم ہونے لگتی ہے۔ پھر انسان کی حیثیت ایک زندہ لاش سے زیادہ نہیں رہتی۔ مسلمان اپنے وجود میں ایک اکائی ہے۔ ایک کا دُکھ دوسرے کا دکھ ہونا چاہیے۔ حضرت نعمان بن بشیر ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ‘ اِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى)) (متفق علیہ)

”اہل ایمان کی ایک دوسرے سے محبت‘ رحم دلی اور باہمی التفات وتعاون کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ اگر ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم بیداری اور بخار کے ذریعے اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔“

آج دنیا جن ہولناک مسائل کا شکار ہے اس کی وجہ سے بحر وبر میں فساد اپنا دائرہ بڑھاتا ہی جا رہا ہے۔ کہیں فرقہ واریت دلوں میں نفرتوں کا بیج بو رہی ہے‘ کہیں غربت وامارت نے ناقابلِ عبور گھاٹیاں پیدا کر دی ہیں‘ کہیں ذات برادری انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دیتی۔ اقبال نے کہا تھا:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

جبکہ ساری کائنات کو تخلیق کرنے والے کے نزدیک افضل اور عزت واکرام والا تو وہ ہے جس کے اندر تقویٰ کا مادہ زیادہ ہے۔ یہ انسانوں کے اپنے وضع کیے ہوئے پیمانے ہیں جن کی اللہ کی نظر میں پرِکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہ کب چاہے گا کہ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں فساد‘ انتشار‘ انارکی اور خشکی وتری میں ہلاکت خیز طوفان برپا ہوں۔ اس کے اپنے ہاتھوں

سے بنائے ہوئے انسانوں کی زندگیاں ان کی بداعمالیوں کے تیز وتند تھپیڑوں میں اُتھل پُتھل ہوتی رہیں۔ اصل میں ہم خود ہی اپنے شامتِ اعمال کو دعوت دیتے ہیں اور نت نئے مسائل کے عفریت ہر سمت سے ہم پر حملہ آور ہونے لگتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہم ان مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی زندگی کے فطری طریق کا سہارا لینے کے بجائے غیر فطری انداز ہی اختیار کرتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر ہمیں پے در پے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم کائنات میں ظاہر ہونے والے تجربات و مشاہدات سے بھی سبق حاصل نہیں کرتے۔ ہم ہمیشہ آنکھیں نیچی کیے‘ ناک کی سیدھ میں چلنا پسند کرتے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کا رویہ اختیار کرتے ہیں‘ زندگی انہیں بیچ منجھدار میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے‘ اور وہ حیران و پریشان کھڑے رہ جاتے ہیں۔ پھر جب انسان ناکامی و نامرادی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو اس کے اندر ایک انتقامی جذبہ ابھرتا ہے۔ اپنے سے بہتر اور آسودہ حال لوگوں کو دیکھ کر فتنہ وفساد برپا کرنے کے منفی جذبات کو مہمیز ملتی ہے اور وہ سوچتا ہے ع ’’ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے!‘‘

فطری طور پر سوچ‘ فکر‘ فہم‘ عقل‘ احساس اور جذبہ مل کر کسی فرد کی شخصیت کو تشکیل دے پاتے ہیں اور اس ڈھانچے کے پیچھے سماج اور معاش کا بالواسطہ ہاتھ ہوتا ہے۔ گویا انسانی کردار بیرونی حالات کے مرہونِ منت پروان چڑھتے اور گرتے ہیں۔ احساس ہمیشہ عقل کی دانائی کا مشورہ دیتا ہے جبکہ جذبہ جنوں کی کیفیت طاری کرتا ہے۔ یوں بے چاری عقل دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اِس آنکھ مچولی کے خود ساختہ اصولوں کی پاداش میں جذبات کی جنگ میں حالات کی مناسبت سے بتدریج بدلتی رہتی ہے۔ عمل سے پہلے سوچ آتی ہے اور وہی عمل کراتی ہے‘ لیکن سوچ عمل سے پہلے دو رستے ضرور دکھاتی ہے۔ گزرے ہوئے حالات اور تجربات کی بنیاد پر محفوظ کردہ سچ کے ذخیروں سے تیز رفتاری کے ساتھ سچائی کا عکس دکھاتی ہے۔ اس عکس میں سچائی کا وہ راستہ بھی سجھاتی ہے جسے حفظِ ماتقدم یعنی دُور رس نتائج کا حامی و ناصر رستہ کہا جاتا ہے۔

عقل دراصل سوچ کا احساس کرنے کی وہ صلاحیت ہے جو سوچ کی چلتی فلم پر ردِّعمل دکھا کر عمل کرتی ہے۔ ہر شخص کی سوچ کا دائرہ وسیع لیکن بے ہنگم ہوسکتا ہے۔ عقل کا پیمانہ ذاتیات کا حامی و ناصر ہوتا ہے‘ جب کہ ذہانت عقل کا وہ صاف و شفاف آئینہ ہے جو جتنا صاف ہوگا‘ زندگی کی پیچیدگیاں اور دقیق حالات کو اُتنا ہی شفاف دکھا کر خوب تر فیصلے کرتا چلا جاتا ہے۔

جب انسان زوال پزیر مادی اقدار کے حصول میں اپنی عمر فنا کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی ذات کو برباد اور اپنی روح کی گہرائیوں میں موجود اعلیٰ احساسات کو ضائع کرتا ہے۔ ایسے انسان کے ذہنی افق پر ایمانی وسعت‘ علمی ثروت اور محبت‘ عشق اور روحانی ذوق کے رنگ کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ وہ ہر کام کے نتیجے کی قدر و منزلت کا تعین اخرویات اور لدنیات کو پسِ پشت ڈال کر محض مادی مفاد‘ جسمانی راحت اور بدنی لذتوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس کے ذہن پر صرف کمانے اور چھیننے‘ لینے دینے‘ خرید و فروخت اور لہو و لعب کی فکر سوار رہتی ہے۔ اگر اس کی خواہشات کی تکمیل کے لیے جائز وسائل کی کمائی ناکافی ہوجائے تو وہ ناجائز ذرائع اپناتا اور گمراہ کن تصورات و خیالات کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان انسانیت کو سنگین قسم کی مشکلات کی طرف دھکیل رہا ہے۔

مغربی فاضل ڈاکٹر الیکسس کیرل (Alexis Carrel) اپنی کتاب The Unknown Man میں لکھتے ہیں:

> ’’موجودہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ ہر ممکن ذریعہ سے دولت حاصل کرے۔ لیکن یہ ذرائع انسان کو دولت کے مقصد تک نہیں پہنچاتے بلکہ اس میں ایک دائمی ہیجان اور جنسی خواہشات کی تسکین کا سطحی جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اثر سے انسان صبر و ضبط سے خالی ہوجاتا ہے اور ہر ایسے کام سے گریز کرتا ہے جو ذرا دشوار اور صبر آزما ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبِ جدید ایسے انسان پیدا ہی نہیں کرسکتی جن میں فنی تخلیق‘ ذکاوت‘ جرأت و ہمت ہو۔ ہر ملک کا صاحبِ اقتدار طبقہ ذہنی اور اخلاقی قابلیت میں نمایاں طور پر انحطاط پزیر نظر آتا ہے۔ ہم یہ محسوس کررہے ہیں کہ تہذیبِ جدید نے اُن بڑی بڑی امیدوں کو پورا نہیں کیا جو انسانیت نے اس سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ ایسے لوگ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے جو ذہانت و جرأت کے مالک ہوں اور تہذیب کو اس دشوار گزار راستے پر سلامتی کے ساتھ لے جاسکیں جس پر آج وہ ٹھوکریں کھا رہی ہے۔‘‘

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کا اسلام کی اصل بنیاد پر یقین کامل نہیں رہا ہے۔ اسی لیے اس پر کوئی عمل بھی نہیں ہو رہا اور یہی وہ المناک سانحہ ہے جس کے سبب مسلمان دنیا کے کینوس سے مٹتے جارہے ہیں۔ آج ان کی صفوں میں نہ توحید باقی ہے نہ اتحاد‘ نہ اطاعت و فرماں برداری کے جذبات۔ نہ کوئی طاقتور امیر ہے نہ جہاد بالسیف کے ولولے‘ نہ ایثارِ مال‘ نہ امت کی زبوں حالی

کا کوئی درد اور نہ ایمان بالآخرہ کا کوئی ٹھوس تصور۔ اِن کی زندگیوں میں نہ مکارمِ اخلاق کا کوئی نمایاں رنگ ہے‘ نہ خوفِ خدا‘ نہ شوقِ اصلاح اور نہ ذوقِ ایمان!

سچی بات تو یہ ہے کہ مدتوں سے غیر اسلامی اور خود ساختہ وضع کیے ہوئے اثرات کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے ہمارا معاشرہ اخلاق و احساس کی روح سے دُور اور انصاف و خدا ترسی کے ان بنیادی اصولوں سے یکسر محروم ہو چکا ہے جو ہمارے دین نے ہمیں عطا کیے تھے۔ جس مادہ پرستی نے دنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں منقسم کر دیا اور ان کے اغراض و مفادات کا تصادم پیدا کیا‘ بدقسمتی سے اسی نے اب ہمارے معاشرے کو بھی مشقِ ستم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گھر کے اندر طبقاتی خود غرضیوں کی کشاکش جبکہ باہر بین الاقوامی خود غرضیوں‘ مفادات اور ذاتی منفعت کی رسہ کشی نے انسانیت اور احترامِ آدمیت کے بخیے ادھیڑ دیے ہیں‘ جس سے فسادِ بحر و بر کا جوار بھاٹا امنڈ آیا ہے۔

اس کرۂ ارض پر زندگی جانوروں کو بھی حاصل ہے اور پودوں اور پتھروں کو بھی۔ اس کو حیات کہتے ہیں۔ البتہ وہ زندگی جو شعور و ادراک کے جوہر سے آراستہ ہو‘ اسے ”زیست“ کہتے ہیں اور یہی اصل زندگی ہے۔ جو اس جوہر سے معمور ہے وہ انسان کہلانے کا مستحق ہے‘ ورنہ انسان تو وہ بھی ہیں جن کے بارے میں قرآن یہ تبصرہ کرتا ہے کہ:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ
لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ١٧٩﴾

(الاعراف)

”اِن کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں‘ ان کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں‘ ان کے کان ہیں مگر اُن سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے گئے گزرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔“

زندہ رہنے کے شعور و ادراک سے محروم شخص انسان نہیں کہلا سکتا۔ حیات تو انسان کو فطرت کی طرف سے ملی ہے۔ اب اس کا کام ہے کہ اس حیات کو زیست میں تبدیل کرے‘ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان پہلے زندگی کی حقیقت تسلیم کرے۔ بسا اوقات ہم مذہب کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور اُس کی محض لفظی حیثیت ہمارے پیشِ نظر رہتی ہے۔ اس طرح وسائل

و مقاصد ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ زندگی صحیح ڈگر سے ہٹ کر خاردار راہوں پر چل پڑتی ہے اور یوں زندگی کی ڈور اُلجھتی ہی چلی جاتی ہے‘ سرا مل ہی نہیں پاتا!

انسان کئی اعتبار سے مجبور بھی ہوتا ہے مگر قدرت کی طرف سے اُسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بامعنی بنائے۔ یہ انسان کی ہمت اور جِدّ و جُہد پر منحصر ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کس حد تک بامعنی بناتا ہے اور کیسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے کہ جس میں اُس کے لیے خیر و بھلائی ہو اور دیگر انسانوں کے لیے بھی سکون و راحت والی زندگی کا حصول ممکن ہو۔ یوں بنی نوع انساں فسادِ بحر و بر کی ہلاکتوں سے محفوظ و مامون ہو جائے گا‘ کیوں کہ جب حالات بدلتے ہیں تو قدریں بھی بدل جاتی ہیں‘ معیارات بدل جاتے ہیں۔ ایک اچھا عمل دوسرے اچھے عمل کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور یوں چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے۔ ورنہ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

جو آنا چاہو ہزار رستے‘ نہ آنا چاہو تو عذر لاکھوں
مزاج برہم‘ طویل رستہ‘ برستی بارش‘ خراب موسم!

مآخذ و مصادر

(ا) اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج: اَسرار عالم
(ب) قرآن اور علم جدید: ڈاکٹر رفیع الدین
(ج) تحریک اسلامی: سید منور حسن
(د) آزاد سوچ: مشہود قادری

❁❁❁

ماہنامہ ”میثاق“ لاہور
داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!
صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟
وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربیّین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔
یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

حسد اور اِس کا علاج

احمد علی محمودی

معنی و مفہوم

حسد سے مراد کسی شخص پر اللہ کی نعمت یا خوش بختی کے زوال کی تمنا کرنا‘ اس کی کامیابی سے جلن محسوس کرنا‘ اس سے کینہ‘ بغض اور عداوت رکھنا‘ بدخواہی کرنا ہے کہ یہ خوش حالی اسے کیوں ملی ہے! حسد کرنے والا چاہتا ہے کہ تمام نعمتیں صرف اسی کے لیے ہوں اور دوسرے لوگ ان سے محروم رہیں۔

بعض علماء لغت نے حسد کے لفظ کو حسدل سے لیا ہے جس کے معنی کھٹمل کے ہیں۔ جس طرح کھٹمل انسان کے بدن کو زخمی کر کے اس کا خون چوستا ہے اسی طرح حسد بھی ایک حاسد سے یہی کام لیتا ہے۔ (ثعلبی: ابوالفتوح رازی)

حسد: قرآنی آیات کی روشنی میں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾﴾ (البقرۃ)

’’اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں پھیر کر تمہارے ایمان کے بعد تمہیں پھر کافر بنا دیں‘ بسبب ان کے دلی حسد کے‘ اس کے بعد کہ اُن پر حق بالکل واضح ہو چکا ہے۔ تو (اے مسلمانو!) تم معاف کرتے رہو اور صرفِ نظر سے کام لو‘ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾﴾ (النساء)

’’کیا یہ حسد کر رہے ہیں لوگوں سے اس پر کہ جو اللہ نے ان کو اپنے فضل میں سے

عطا کر دیا ہے؟ تو ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور انہیں بہت بڑی حکومتیں بھی دیں۔‘‘

مذکورہ بالا آیات کے سیاق وسباق اور مفسرین کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے زمانے کے بعض یہودیوں کے بارے میں ہیں جو اسلام کی شوکت اور اس کے چاہنے والوں سے حسد کرتے تھے۔ مزید ارشاد ہوا:

﴿إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿١٢٠﴾﴾ (آل عمران)

’’(اے مسلمانو!) اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچ جائے تو وہ ان کو بُری لگتی ہے‘ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر تم صبر کرتے رہو اور تقویٰ کی روش اختیار کیے رہو تو ان کی ساری چالیں تمہیں کوئی مستقل نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں یقیناً اللہ تعالیٰ اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔‘‘

کسی کی خوشی سے غمگین ہونا اور کسی کی تکلیف پر خوش ہونا‘ جیسا کہ سورۃ آل عمران کی درج بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے‘ یہ بھی حسد ہی ہے۔

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٣٢﴾﴾ (النساء)

’’اور تمنا نہ کیا کرو اُس شے کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے۔ مَردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں گے اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اُس میں سے جو وہ کمائیں گی۔ اور اللہ سے اُس کا فضل طلب کرو‘ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔‘‘

بعض آیات میں حسد کا لفظ یا اس کے مشتقات استعمال نہیں ہوئے لیکن ان کے معانی سے پتا چلتا ہے کہ یہ حسد کے بارے میں ہی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت میں مؤمنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ اللہ نے ان کو دیا ہے اس پر راضی رہیں اور جو دوسروں کو دیا ہے اس پر تنگ دل نہ ہوں۔ اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس کا مطلب ہے کہ اُس میں حسد پیدا ہو رہا ہے۔

﴿اِذۡ قَالُوۡا لَیُوۡسُفُ وَ اَخُوۡہُ اَحَبُّ اِلٰۤی اَبِیۡنَا مِنَّا وَ نَحۡنُ عُصۡبَۃٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنِ ۚ﴿۸﴾﴾ (یوسف)

''جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں جبکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں۔ یقیناً ہمارے والد صریح غلطی پر ہیں۔''

سورۃ یوسف کی درج بالا آیت میں حضرت یعقوب ؑ کی حضرت یوسف ؑ کے ساتھ بے انتہا محبت کی وجہ سے یوسف ؑ کے بھائیوں کی ان سے شدید نفرت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف ؑ کے بھائیوں کا یہ عمل حسد کی بنا پر تھا۔

﴿وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ (الحجر)

''اور ہم نکال دیں گے ان کے سینوں میں سے جو کچھ بھی کدورت ہو گی، بھائی بھائی بن کر (وہ بیٹھے ہوں گے) تختوں پر آمنے سامنے۔''

جنت کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہوں گے، وہاں بغض و کینہ کا گزر نہ ہو گا۔

﴿وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾﴾ (الفلق)

''اور حسد کرنے والے کے شر سے (مَیں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں) جب وہ حسد کرے۔''

جب ایک انسان دوسرے انسان سے حسد کرتا ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنے حاسدانہ جذبات سے مغلوب ہو کر عملی طور اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے۔ اس لیے حاسد کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ بے حد ضروری ہے۔ سورۃ الفلق کی درج بالا آیت میں اسی پناہ کا ذکر ہے۔

کسی مسلمان کے دل میں کسی دوسرے مسلمان کے لیے کینہ، بغض، حسد یا کدورت نہیں ہونی چاہیے۔ صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ ہم اپنے اور اپنے اسلاف کے حق میں یہ دعا کرتے رہا کریں:

﴿رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَ لِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ وَ لَا تَجۡعَلۡ فِیۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّکَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۰﴾﴾ (الحشر)

''اے ہمارے رب! تو بخش دے ہمیں بھی اور ہمارے اُن بھائیوں کو بھی جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کدورت نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو نہایت شفیق اور رحم فرمانے والا ہے۔''

حسد: احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)) (ابوداوٗد)

''حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔''

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَجْتَمِعَانِ فِيْ قَلْبِ عَبْدٍ الْاِيْمَانُ وَالْحَسَدُ)) (النسائی)

''کسی بندے کے دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہو سکتے۔''

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَكْذِبُه وَلَا يَحْقِرُهُ، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا - وَيُشِيْرُ إِلٰى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ - بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ)) (مسلم)

''ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، خرید و فروخت میں ایک دوسرے کو دھوکا نہ دو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ مت پھیرو۔ کسی کی بیع پر بیع مت کرو۔ اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اسے حقیر سمجھتا ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری یہاں ہے! اور آپ ﷺ نے اپنے سینے (دل) کی طرف تین بار اشارہ فرمایا (یعنی ظاہر میں اچھے عمل کرنے سے آدمی متقی نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کا سینہ صاف نہ ہو) کسی آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔ ہر مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے۔''

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ، وَلَا تَحَسَّسُوْا، وَلَا تَجَسَّسُوْا، وَلَا تَنَافَسُوْا، وَلَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا،

وَكُونُوا عِبادَ اللّٰهِ إخْوانًا)) (صحيح البخاري)

’’بدگمانی سے بچتے رہو کیونکہ بدگمانی (اکثر تحقیق کے بعد) جھوٹی ترین بات ہوتی ہے‘ اور کسی کے عیوب ڈھونڈنے کے پیچھے نہ پڑو‘ کسی کا عیب خواہ مخواہ مت ٹٹولو‘ کسی کے بھاؤ پر بھاؤ نہ بڑھاؤ‘ آپس میں حسد نہ کرو‘ بغض نہ رکھو‘ کسی کی پیٹھ پیچھے برائی نہ کرو‘ بلکہ سب اللہ کے بندے آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔‘‘

حضرت انس ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَاتَقَاطَعُوْا، وَلَاتَدَابَرُوْا، وَلَاتَبَاغَضُوْا، وَلَاتَحَاسَدُوْا، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ)) (سنن الترمذی)

’’آپس میں مقاطعہ نہ کرو اور نہ ملاقات کے وقت ایک دوسرے سے منہ موڑو‘ اور نہ کینہ وبغض رکھو اور نہ حسد رکھو‘ اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے۔‘‘

حضرت ابوایوب انصاری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَايَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هٰذَا وَيُعْرِضُ هٰذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ)) (متفق علیه)

’’کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ تین راتوں سے زیادہ اپنے بھائی سے قطع تعلق رکھے بایں طور کہ ان کا آمنا سامنا ہو تو وہ ایک دوسرے سے منہ موڑ لیں۔ ان میں سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرلے۔‘‘

بعض احادیث میں ’’حسد‘‘ بمعنی ’’رشک‘‘ بھی آیا ہے جو قابلِ مذمت نہیں ہے۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی رو سے صرف دو آدمی قابلِ رشک ہیں۔ حضرت ابن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُل آتاهُ اللّٰهُ مَالًا، فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الحَقِّ، وَرَجُل آتاهُ اللّٰهُ حِكْمَةً فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا)) (متفق علیه)

’’حسد (بمعنی رشک) صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہو اور وہ اس کو راہِ حق میں خرچ کرنے پر لگا دے‘ اور دوسرا یہ کہ کسی شخص کو اللہ نے حکمت (کی دولت) سے نوازا ہو اور وہ اس کے ساتھ فیصلہ کرتا ہو اور (لوگوں کو) اس حکمت کی تعلیم دیتا ہو۔‘‘

حضرت عبداللہ ابن عمر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا حَسَدَ إِلَّا عَلَى اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ القرآنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ)) (متفق علیه)

’’حسد (یعنی رشک) صرف دو اشخاص پر جائز ہے۔ ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ مال عطا کرے اور وہ دن رات اُسے (خیر کے راستے میں) خرچ کرتا رہے‘ اور دوسرا وہ کہ کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ قرآن سے نوازے اور وہ دن رات اس (کی تلاوت اور تعلیم و تدریس) میں لگا رہے۔‘‘

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلَي مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي المَالِ وَالخَلْقِ، فَلْيَنْظُرْ إِلَي مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ)) (صحیح البخاری)

’’جب تم میں سے کوئی شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو مال اور شکل وصورت میں اِس سے بڑھ کر ہو تو اُسے چاہیے کہ ایسے شخص کی طرف بھی دیکھ لے جو مال اور شکل وصورت میں اُس سے کم تر درجے کا ہے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تُعْرَضُ الْاَعْمَالُ فِيْ كُلِّ اثْنَيْنِ وَخَمِيْسٍ، فَيَغْفِرُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ لِكُلِّ امْرِئٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا، اِلَّا امْرُؤٌ كَانَتْ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ، فَيَقُوْلُ: اَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا)) (صحیح مسلم)

’’ہر سوموار اور جمعرات کو انسانوں کے اعمال (اللہ تعالیٰ کے سامنے) پیش کیے جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اِن دنوں میں سوائے مشرک کے ہر ایک کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ البتہ جن دو آدمیوں کے درمیان بغض وکینہ ہوتا ہے ان کی مغفرت نہیں فرماتا۔ (فرشتوں کو حکم) فرماتا ہے کہ اِن دونوں کو ابھی (مغفرت سے) چھوڑے رکھو‘ یہاں تک کہ دونوں ملاپ کرلیں۔‘‘

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ شرک اور کینہ ایک اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ جس طرح مشرک کی بخشش نہیں ہے‘ اسی طرح کینہ پرور کی بھی مغفرت نہیں ہے۔

حضرت زبیر بن عوام ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ، اَلْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ، هِيَ الْحَالِقَةُ: لَا أَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ)) (سنن الترمذی)

’’پہلی اُمتوں کی بیماری آہستہ آہستہ تمہاری طرف سرکتی آ رہی ہے۔ وہ حسد اور دشمنی ہے۔ وہ مونڈنے والی ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے‘ بلکہ دین کو مونڈ کر صاف کر دیتی ہے۔‘‘

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَخْلَصَ قَلْبَهٗ لِلْاِيْمَانِ وَجَعَلَ قَلْبَهٗ سَلِيْمًا وَلِسَانَهٗ صَادِقًا وَنَفْسَهٗ مُطْمَئِنَّةً وَخَلِيْقَةً مُسْتَقِيْمَةً)) (رواہ احمد والبیہقی)

’’وہ شخص فلاح کو پہنچ گیا جس نے ایمان کے لیے اپنے دل کو خالص کر لیا اور اپنے دل کو صاف کر لیا‘ اپنی زبان سچی بنا لی‘ اپنے نفس کو اطمینان بخش بنا لیا اور اپنی طبیعت کو حسن خلق کے سانچے میں ڈھال لیا۔‘‘

حسد: سلف صالحین کی نظر میں

امام ابن عیینہ رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ’’حسد وہ پہلا گناہ ہے جو آسمان پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے کیا گیا‘ یعنی شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کیا۔ اور یہی وہ پہلا گناہ ہے جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے کیا گیا‘ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے نے اپنے بھائی پر حسد کیا اور اُس کو قتل کر دیا۔‘‘ (المجالسة وجواہر العلم‘ ج:۳‘ ص:۵۱)

مضارب بن حزن رحمہ اللہ علیہ کہتے ہیں: ’’حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر کس چیز نے اُبھارا‘ تو آپؓ نے فرمایا: ’حسد‘ نے۔‘‘ (کتاب السنۃ‘ ج:۲‘ ص:۵۵۶)

امام اصمعی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ’’مَیں نے بنوعذرہ نامی قبیلہ میں ایک اعرابی (بدو) کو دیکھا جس کی ایک سو بیس سال عمر تھی۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ تمہاری اتنی لمبی عمر کا راز کیا ہے‘ تو اُس نے بتایا: ’مَیں نے حسد کرنا چھوڑ دیا ہے‘ اس لیے ابھی تک باقی (زندہ) ہوں۔‘‘ (المجالسة وجواہر العلم‘ ج:۳‘ ص:۵۲)

رجاء بن حیوۃ رحمہ اللہ علیہ کہتے ہیں: ’’جو کوئی موت کو اکثر یاد کرتا ہو وہ حسد اور خوشی کو ترک کر دیتا ہے۔‘‘ (حلیۃ الاولیاء‘ ج:۵‘ ص:۷۳)

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ علیہ کہتے ہیں: ’’کینہ‘ حسد ہی کو کہتے ہیں۔ جو انسان سے نکلے وہ شر ہے اور جو اس میں باقی رہے وہ کینہ ہے‘ اور جس شخص میں حسد نام کی ذرا سی بھی کوئی چیز ہوتی ہے‘ وہ صحیح سلامت نہیں رہتا۔‘‘ (حلیۃ الاولیاء‘ ج:۷‘ ص:۲۸۴)

امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ’’حسد یہ ہے کہ حاسد منعم علیہ سے زوالِ نعمت کی تمنا کرے اور بسا اوقات حاسد محسود سے ان نعمتوں کے زوال کے درپے ہوتا ہے۔‘‘ (مفردات القرآن‘ ص ۲۳۴)

الغرض حسد‘ کینہ‘ بغض اور کھوٹ ایسی باطنی اور روحانی بیماریاں ہیں جو انسان کو نیک اعمال کی طرف راغب نہیں ہونے دیتیں‘ بلکہ پہلے سے جو نیک اعمال اُس نے کیے ہوتے ہیں‘ اُن کو بھی ضائع کر دیتی ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ انسان اعمالِ صالحہ سے دور ہوتے ہوتے معاصی اور گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس سے اعمالِ صالحہ کی توفیق چھین لیتے ہیں‘ اور وہ کوئی نیک عمل نہیں کر سکتا۔

جنّت کی بشارت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’ابھی تمہارے پاس ایک جنتی آدمی آئے گا۔‘‘ اتنے میں ایک انصاری آئے جن کی داڑھی سے وضو کے پانی کے قطرے گر رہے تھے اور اُنہوں نے بائیں ہاتھ میں جوتے لٹکا رکھے تھے۔ اگلے دن پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی بات فرمائی‘ تو پھر وہی انصاری اسی طرح آئے جس طرح پہلی مرتبہ آئے تھے۔ تیسرے دن پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ویسی ہی بات فرمائی اور وہی انصاری اسی حال میں آئے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے اُٹھے تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما اُس انصاری کے پیچھے گئے‘ اور اُن سے کہا: ’’میرا اپنے والد صاحب سے جھگڑا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے مَیں نے قسم کھالی ہے کہ مَیں تین دن تک اُن کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اگر مناسب سمجھیں تو آپ مجھے اپنے ہاں تین دن ٹھہرا لیں!‘‘ اُنہوں نے کہا: ’’ضرور!‘‘ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ: ’’مَیں نے اُن کے پاس تین راتیں گزاریں‘ لیکن مَیں نے اُن کو رات میں زیادہ عبادت کرتے ہوئے نہ دیکھا۔ البتہ جب رات کو اُن کی آنکھ کھل جاتی تو بستر پر اپنی کروٹ بدلتے اور تھوڑا سا اللہ کا ذکر کرتے اور ’’اللہ اکبر‘‘ کہتے۔ پھر نمازِ فجر کے لیے بستر سے اُٹھتے۔

ہاں! جب بات کرتے تو خیر ہی کی بات کرتے۔

جب تین راتیں گزر گئیں اور مجھے اُن کے تمام اعمال معمول ہی کے نظر آئے (اور مَیں حیران ہوا کہ حضورﷺ نے اِن کے لیے بشارت تو اتنی بڑی دی ہے لیکن ان کا کوئی خاص عمل تو ہے ہی نہیں) تو مَیں نے اُن سے کہا: ’’اے اللہ کے بندے! میرا والد صاحب سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا‘ نہ کوئی ناراضی ہوئی‘ اور نہ مَیں نے اُنہیں چھوڑنے کی قسم کھائی‘ بلکہ قصہ یہ ہوا کہ مَیں نے حضورﷺ کو آپ کے بارے میں تین مرتبہ یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: ’’ابھی تمہارے پاس ایک جنتی آدمی آنے والا ہے۔‘‘ اور تینوں مرتبہ آپ ہی آئے۔ اِس پر مَیں نے سوچا کہ مَیں آپ کے ہاں رہ کر آپ کا خاص عمل دیکھوں اور پھر اس عمل میں آپ کے نقشِ قدم پر چلوں۔ مَیں نے آپ کو کوئی بڑا کام کرتے ہوئے تو دیکھا نہیں‘ تو اب آپ بتائیں کہ آپ کا وہ کون سا خاص عمل ہے جس کی وجہ سے آپ اس درجہ کو پہنچ گئے جو حضورﷺ نے بتایا؟ اُنہوں نے کہا: ’’میرا کوئی خاص عمل تو ہے ہی نہیں‘ وہی اعمال ہیں جو تم نے دیکھے ہیں۔‘‘

مَیں یہ سن کر چل پڑا۔ جب مَیں نے پشت پھیری تو اُنہوں نے مجھے بلایا اور کہا: ’’میرے اعمال تو وہی ہیں جو آپ نے دیکھے ہیں‘ البتہ ایک خاص عمل ہے کہ میرے دل میں کسی مسلمان کے بارے میں کھوٹ نہیں ہے‘ اور کسی کو اللہ نے کوئی خاص نعمت عطا فرما رکھی ہو تو مَیں اِس پر اُس سے حسد نہیں کرتا۔‘‘ مَیں نے کہا: ’’اسی چیز نے آپ کو اتنے بڑے درجے تک پہنچایا ہے۔‘‘

(مسند احمد وسنن النسائی‘ بحوالہ حیاۃ الصحابہؓ‘ ج:۲‘ ص:۴۵۸‘۴۵۹)

حسد کے نقصانات

(۱) ایک حاسد شخص اللہ سے بدگمان ہو جاتا ہے‘ اس کی سوچ غلط رُخ پر کام کرنے لگتی ہے اور اس کے قول وعمل اور شب وروز کی سرگرمیوں سے خدا کے بارے میں بدگمانی اور ناانصافی کا اظہار ہونے لگتا ہے۔

(۲) حاسد تعمیری ذہن وفکر اور اصلاح وفلاح کی کاوش سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو بنانے‘ مستقبل کو سنوارنے اور اصلاح وسدھار کے کام کرنے کے بجائے ہر وقت اضطراب اور بے چینی میں مبتلا رہتا ہے کہ جن کو خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے ان کی شخصیت کو مجروح کرے‘ ان کو نقصان پہنچائے‘ ان کی تذلیل وتنقیص کرے اور اُن کی اذیت وتکلیف رسانی کا سامان کرے۔

(۳) حاسد کو یہ بات گھن کی طرح اندر ہی اندر کھاتی ہے کہ دوسرے شخص کو کوئی آرام‘ فائدہ یا اچھی چیز نصیب ہی کیوں ہوئی! یہ سوچ اُسے مقابل شخص کی طرف معاندانہ ردِّعمل پر مائل کرتی ہے اور وہ اسے نقصان پہنچا کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مقابل شخص سے وہ نعمت‘ سہولیات یا آرام چھین لیا جائے جو خود اِسے نصیب نہیں ہوا۔ حسد سے ہی بدنظری اور جادو جنم لیتا ہے جو اس وقت ہمارے معاشرے میں عام ہے۔

(۴) حاسدانہ جذبات کے حامل لوگ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو نقصان پہنچانے کے لیے سفلی عمل (کالا جادو) وغیرہ کے عاملوں کا سہارا لیتے ہیں اور انہیں برباد کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ کاروبار میں نقصان‘ مالی بدحالی‘ شادی میں رکاوٹ‘ ازدواجی تعلقات میں کشیدگی اور اولاد کی بندش جیسے مکروہ اعمال کی بنیاد زیادہ تر حسد ہی ہوتی ہے۔

(۵) یوں تو حاسد دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن دراصل وہ خود کو بھی نقصان پہنچا رہا ہوتا ہے۔ حاسد کے ذہن پر ہر وقت اپنی محرومی کا افسوس سوار رہتا ہے۔ وہ اپنے سے برتر شخص کو دیکھ کر غصے میں آ جاتا ہے۔ یوں اپنے آپ کو خود ہی ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں اس کا ذہنی سکون ختم ہو جاتا ہے۔ غصہ‘ ڈیپریشن‘ احساسِ کمتری اور چڑچڑاپن جیسی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(۶) حاسد کے دل میں منفی جذبات ہی موجزن رہتے ہیں۔ وہ نفرت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ گویا وہ دوسروں کی بھلائی کے لیے بہت کم سوچتا ہے۔ ظاہر ہے جس شخص کا دل سیاہ ہو گا وہ صحت مند سرگرمیوں کا حصہ بن ہی نہیں سکتا۔

(۷) حسد ایک ایسی روحانی بیماری ہے جس کا شکار دنیا ہی میں نفسیاتی اذیت اٹھاتا اور دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر مختلف ذہنی وجسمانی امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یعنی حاسد کی سزا کا عمل اِس دنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے قرآن کریم میں حسد کرنے والے کے شر سے اللہ ربّ الناس کی پناہ مانگی گئی ہے‘ کیونکہ وہ اس باؤلے پن میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔

(۸) حاسد ہمیشہ اپنی قسمت اور مقدر سے نالاں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اَن گنت نعمتیں جو اس کو حاصل ہیں انہیں بھول جاتا ہے۔ اس طرح حسد کرنے والا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے

سے بھی قاصر رہتا ہے۔

(۹) حسد کرنے والا چونکہ دوسروں کی خوبیوں کو برداشت نہیں کر سکتا‘ اس لیے ان کی کسی بات پر تعریف یا پذیرائی نہیں کرتا۔ اگر تعریف کرتا بھی ہے تو اس انداز میں کہ اس کے اندر نفرت اور طنز واضح ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے لوگ اس کی مجلس میں خوش نہیں ہوتے اور اس سے دور رہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

(۱۰) یوں حاسد ایک طرف تو تنہائی اور دوسری طرف عدم تحفظ کا بھی شکار ہو جاتا ہے‘ کیونکہ جس شخص سے ہر کوئی دور ہوتا رہے تو اُس میں کئی طرح کے خوف اور احساسِ عدم تحفظ پروان چڑھتے ہیں۔

(۱۱) حسد ایک ضرر رساں جذبہ ہے‘ اس لیے اس پر قابو پانا بہت ضروری ہے۔ یہ جذبہ انسان کی شخصیت کو بری طرح تباہ کر دیتا ہے اور حاسد کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہو پاتا۔ حاسدانہ خیالات انسانی ذہن پر غالب آ جائیں تو ساری دنیا دشمن نظر آنے لگتی ہے۔ اور دشمنی کی یہ آگ گھروں اور معاشرے میں فساد پھیلانے کا باعث بنتی ہے۔

(۱۲) حسد دیگر اخلاقی گناہوں کا سبب بنتا ہے‘ جن میں غیبت‘ بہتان‘ تجسس اور جھوٹ وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح حسد آخرت میں بھی اللہ ربّ العزت کی ناراضی کا موجب ہے۔

رشک اور حسد میں فرق

رشک اور حسد دو مختلف چیزیں ہیں۔ پہلی صفت پسندیدہ تو دوسری مذموم ہے۔ رشک کے اندر اخلاقی اعتبار سے کوئی بُرائی نہیں ہے‘ بلکہ وہ محاسنِ اَخلاق میں سے ہے اور ترقی کا محرک ہے۔ اِس کے بالکل برعکس حسد ہے‘ جس میں حاسد محسود جیسا بننا نہیں چاہتا‘ بلکہ اُس کی نعمت کا زوال چاہتا ہے‘ اور بلاوجہ دل میں دشمنی کو پالتا ہے۔ اِس کے علاوہ حاسد اللہ کی تقدیر سے ناخوش اور بیزار رہتا ہے۔

رشک اور حسد میں یہ فرق ہے کہ رشک میں انسان دوسروں کی نعمتوں کے زائل ہونے کی آرزو نہیں کرتا‘ بلکہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کاش وہ بھی ان نعمتوں سے بہرہ مند ہوتا! رشک حسد کے مقابلے میں ایک اچھی صفت ہے۔ رشک مؤمنین جبکہ حسد کفار و مشرکین‘ یہود و نصاریٰ اور منافقین کی خصلت ہے۔

حسد کا علاج

(۱) اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہیں کہ میرے بھائی کے پاس جو بھی نعمتیں ہیں یہ سب رب تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں۔ رب تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ جسے چاہے‘ جو چاہے‘ جتنا چاہے‘ اور جس وقت چاہے عطا فرما دے۔

(۲) حسد کا سبب بننے والی نعمتوں پر غور کیجیے کہ اگر وہ دنیوی نعمتیں ہیں تو عارضی ہیں اور عارضی چیز پر حسد کیسا؟ اگر دینی شرف وفضیلت ہے تو یہ رب تعالیٰ کی عطا ہے اور اس کی عطا پر حسد کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔

(۳) جن نعمتوں پر حسد پیدا ہو رہا ہے‘ اللہ سے دعا کریں کہ اگر یہ نعمتیں آپ کے حق میں بہتر ہیں تو وہ آپ کو بھی مل جائیں۔ وگرنہ بلاوجہ خواہشات کا غلام بن کر ذہن کو پراگندہ ہونے سے بچائیں۔

(۴) وہ مادی چیزیں جو آپ کو حسد پر مجبور کرتی ہیں انہیں عارضی اور کمتر سمجھتے ہوئے جنت کی نعمتوں کو یاد کریں۔

(۵) حسد کی تباہ کاریوں پر نظر رکھیے کہ یہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی ناراضی کا سبب ہے۔ حسد سے نیکیاں ضائع ہوتی ہیں۔ غیبت‘ بدگمانی‘ چغلی جیسے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ روحانی سکون برباد ہو جاتا ہے۔

(۶) موت کو یاد کیجیے کہ عنقریب مجھے یہ زندگی چھوڑ کر اندھیری قبر میں اترنا ہے۔ موت کی یاد تمام گناہوں بالخصوص حسد سے چھٹکارے کا بہترین ذریعہ ہے۔

(۷) لوگوں کی نعمتوں پر نگاہ نہ رکھیے کہ عموماً اس سے احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے جو حسد کا باعث بنتا ہے۔ اپنے سے نیچے والوں پر نظر رکھیے اور بارگاہِ رب العزت میں شکر ادا کیجیے۔

(۸) حسد سے بچنے کے فضائل پر نظر رکھیے کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی رضا کا سبب‘ جنت کے حصول میں معاون‘ بروزِ قیامت سایۂ عرش میں جگہ ملنے کا سبب بننے والے اعمال میں سے ایک ہے۔

(۹) اپنی خامیوں کی اصلاح میں لگ جائیں۔ اس طرح حسد جیسے گناہ کے کام کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔

(۱۰) کمتری کے احساس کو ہرگز غالب نہ آنے دیں۔ جہاں احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی کا غلبہ ہوتا ہے‘ عموماً وہیں سے منفی سوچ کا آغاز ہوتا ہے۔

(۱۱) دوسروں کے ساتھ اپنا موازنہ اِس نیت سے ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ آپ اِن سے کمتر یا بہتر ہیں‘ بلکہ دوسروں کی صلاحیتوں کو دیکھ کر اُن سے استفادہ کریں اور اپنی ذات میں اصلاح لانے کی کوشش کریں۔

(۱۲) محسود (جس سے حسد کیا جائے) سے مل کر محبت اور خوشی کا اظہار کریں اور نفرت کو محبت میں بدلنے کی تدبیر کریں۔ بوقتِ ملاقات سلام میں پہل کریں‘ تحائف پیش کریں‘ بیمار ہونے کی صورت میں بیمار پُرسی کریں‘ خوشی کے موقع پر مبارک باد دیں‘ مشکل میں ہو تو اُس کی مدد کریں۔ الغرض جس قدر ممکن ہو اُسے فائدہ پہنچائیں۔

(۱۳) اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کریں۔ جو کچھ آپ کو اللہ نے عطا کیا ہے اس پر سب کے سامنے شکر کا اظہار کریں۔

(۱۴) یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف اور منفرد ہے۔ اپنی انفرادیت کو دوسروں کی شخصی صفات سے موازنہ کر کے نقصان نہ پہنچائیں۔ جو کچھ آپ کو حاصل ہے وہ ہر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو صفات آپ میں ہیں وہ دوسروں میں نہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ جو کچھ دوسروں کے پاس ہے وہ آپ کے پاس بھی ہو۔

(۱۵) دوسروں کی نعمت پر افسوس کرنا ایک منفی ردِّعمل ہے۔ اِس سے پرہیز کریں۔

(۱۶) اپنے آپ کو صحت مند سرگرمیوں میں مصروف رکھیں۔

(۱۷) وقتاً فوقتاً اپنا تجزیہ کرتے رہا کریں۔ نیز دوسروں پر بلاوجہ تنقید سے پرہیز کریں اور ایسے دوستوں سے بھی دُور رہیں جو بری عادات کا شکار ہیں۔ دوسروں کی تعریف کیا کریں۔ اس طرح آپ منفی سوچ سے دُور رہیں گے۔

(۱۸) ہر وقت نفس وشیطان کے مکروفریب سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پناہ مانگتے رہیں۔ جب بھی دل میں حسد کا خیال آئے تو فوراً اس خیال کو جھٹک دیں اور اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ‘ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کا ورد کریں۔

(۱۹) حسد اور دیگر تمام گناہوں سے سچی توبہ کریں اور اس توبہ پر استقامت کی دعا بھی کریں۔

❁❁❁

دین کی دعوت اور سوشل میڈیا

مولانا عبدالمتین☆

اس تحریر کا مقصد یہ طے کرنا بالکل بھی نہیں کہ سوشل میڈیا برا ہے یا اچھا‘ جائز ہے یا ناجائز‘ البتہ اس کے استعمال پر جو ردِّعمل دیکھنے کو مل رہا ہے وہ ہم سب کو پریشان کر رہا ہے۔

سوشل میڈیا اور دین کی دعوت

آج کل جب کبھی ویڈیوز اور سوشل میڈیا کے حوالے سے کوئی معمولی نوعیت کی تنقید بھی کی جائے تو اکثر یہ دلیل سامنے آتی ہے کہ ”سوشل میڈیا کے ذریعے دین کی بات پوری دنیا تک پہنچ جاتی ہے اور اس سے دور دراز کے علاقوں تک کروڑوں لوگ مستفید ہو جاتے ہیں جبکہ مسجد‘ مدرسہ یا کسی کمرے میں درس دینے والا اتنے زیادہ لوگوں تک اپنی بات نہیں پہنچا سکتا۔“

سوشل میڈیا اور موجودہ حالات

اس ردِّعمل پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: سوشل میڈیا کے ذریعے اب تک کتنے لوگ توبہ تائب ہو چکے ہیں؟ کتنے تہجد گزار بن چکے ہیں؟ کتنے فرماں بردار‘ کتنے داعی‘ کتنے طالب علم اور کتنے ایسے ہیں جن کی زندگی نیٹ نے بالکل بدل دی؟

اس کے برعکس ہم اچھی طرح جانتے ہیں‘ اور اگر نہیں جانتے تو اپنے اردگرد ایک گہری نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ کتنے ہیں جو سوشل میڈیا میں مگن ہو کر اسی دنیا کے ہو کر رہ گئے۔ پہلے وہ موبائل استعمال کرتے تھے اور اب ان کو موبائل استعمال کرنے لگا ہے۔ پہلے وہ والدین کی آواز پر لبیک کہتے تھے‘ اب وہ کسی اشتہار کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ ان کی مجموعی فکر سبسکرائبر سے شروع ہوتی ہے اور موبائل چارج پر ختم ہو جاتی ہے۔ سوشل میڈیا میں مگن شخص بے مقصد سرگرمیوں میں گھنٹوں برباد کرتا ہے جبکہ کسی بڑے کے حکم پر پانچ منٹ دینا بھی اسے بھاری لگتے

☆ مدیر مدرسہ دارارقم‘ لیاری‘ کراچی‘ فون: 0322-2582957

ہیں۔ پہلے وہ صرف بے نمازی تھا‘ اب ملحد بھی بننے لگا ہے۔ پہلے سو کر اٹھتا تھا تو ماں کو ڈھونڈتا تھا‘ اب موبائل ڈھونڈتا ہے۔ اس کے نیم مذہبی خیالات سے پورا گھر پریشان رہتا ہے‘ نیم سیاسی تجزیوں سے معاشرہ تنگ آ چکا ہے۔ اخلاق وفکر ہو‘ عقیدہ وعمل ہو‘ اس کی شخصیت میں ظاہر و باطن فقط تضاد ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

تجوید ٹھیک ہو یا نہ ہو‘ قراء کو ہدفِ تنقید بنالیتا ہے۔ علم کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو لیکن علماء کو موضوع بناتا ہے۔ فنِ تاریخ پر کبھی کچھ پڑھا ہی نہ ہو‘ اسلاف پر تنقید کرتا ہے۔ سیاسی شخصیات کو پوجتا ہے یا پھر ان کی شخصیت پر کیچڑ اچھالتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ یہ شخص چاہتا کیا ہے! اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کا میدانِ عمل کیا ہے؟ اس کی تعلیم وصلاحیت کیا ہے؟ آخر یہ ٹھیکہ اسے ملا کہاں سے ہے اور یہ خود اختیار کردہ ٹھیکے داری معاشرے کو کب تک برداشت کرنی پڑے گی؟

ایجادات کا اصول

یہ اصول ماہرینِ فن بتاتے رہتے ہیں کہ کسی ایجاد کردہ چیز کا مقصد وہی ہوتا ہے جو اس کا موجد (ایجاد کرنے والا) طے کرے۔ وہ مقصد بالکل بھی نہیں ہوتا جو مجھے اور آپ کو اچھا لگے یا ہم آپ بیٹھ کر طے کریں۔

سوشل میڈیا کا حقیقی مقصد

سوشل میڈیا کی دنیا آباد کرنے والوں کا یہ مقصد بالکل بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے اشاعتِ دین کی راہ کھول سکیں۔ وہ فقط سرمایہ کاری کی نیت سے یہ سب کر رہے ہیں اور بہت پیسہ بنا رہے ہیں۔ اگر کسی خطیب کو یوٹیوب چینل کی مطلوبہ اشاعت پر کوئی اعزاز پیش کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہوتی کہ آپ نے دین کی بڑی خدمت کی ہے بلکہ وہ اعزاز اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ نے ہماری دکان چمکانے میں مدد کی اور ہمارے کاروبار کو آپ کی شرکت کی وجہ سے بڑا نفع ہوا۔

پوری دنیا تک دین کی بات پہنچانا

سوال یہ ہے کہ شریعت میں یہ کہاں لکھا ہے کہ ہر شخص کو دین کی بات پوری دنیا میں پھیلانی

چاہیے! عقل کی رُو سے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس جذبے کا ایک شدید نقصان یہ دیکھنے کو ملا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے گھربار اور متعلقہ لوگوں تک دین کی بات پہنچانے میں ناکام ہو جاتا ہے اور پھر اسے کہا جائے کہ دعوت کا یہ کام پوری دنیا میں بھی کرنا پڑے گا تو وہ ابتداء ہی میں خوف زدہ ہو جاتا ہے۔

دین کی دعوت کا دائرہ کار

دعوت کے باب میں شریعت یہ بتلاتی ہے کہ ہر شخص نگران اور سرپرست کی حیثیت رکھتا ہے‘ جس سے اس کے ماتحت لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ چنانچہ ہر ایک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے متعلقین تک دین کی مکمل دعوت حکمت اور درست انداز سے پہنچائے۔ اس سے زیادہ شریعت نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ البتہ حکومتی سطح پر دعوت کے اصول کچھ اور ہیں لیکن ان کا تعلق عام زندگی سے نہیں ہے۔

دنیا کا تقریباً ہر فرد کسی نہ کسی رشتے سے بندھا ہوا ہے۔ دعوت کا کام جب اس نہج پر ہوگا تو وہ خود ہر جگہ پہنچ جائے گی۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا دعوتی طریقہ

اسے شریعت نے دعوت کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ ہر ایک تک دین کی بات پہنچانا کسی کی ذمہ داری میں شامل نہیں کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی قرآن کا یہی خطاب ہے کہ ﴿اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ﴾ ”آپ کے ذمہ بس بات پہنچانا ہے“ ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾﴾ (الغاشیۃ) ”آپ لوگوں پر مسلط نہیں ہیں“۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کے ذمہ بھی بات کو احسن طریقے سے پہنچانا تھا‘ بات منوانا یا نتیجہ نکالنا ان کی دعوتی ذمہ داریوں میں شامل نہیں تھا۔ یہی غلط فہمی آج ہر ایک کو ہے کہ بس زیادہ سے زیادہ بات سوشل میڈیا پر پھیلاؤ تاکہ لوگ مان جائیں‘ حالانکہ یہ نہ اخلاقی لحاظ سے درست ہے اور نہ دعوتی مزاج کے موافق ہے۔ ❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

امام زمخشریؒ

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

امام زمخشریؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، فاضل، ادیب، نحوی اور مفسرِ قرآن تھے۔ ’’الکشاف‘‘ ان کی مشہورِ زمانہ تفسیر ہے جو آج تک سوچ بچار کی نئی نئی راہیں کھولتی چلی آ رہی ہے۔ ذیل میں امام صاحب کی مجمل سوانحِ حیات اور ان کی تفسیر پر مختصر سا تبصرہ دیا جا رہا ہے۔

نام ونسب

آپ کا نام محمود بن عمر بن محمد ہے، جبکہ کنیت ابوالقاسم روایت کی جاتی ہے۔ مختلف مصنّفین نے آپ کو الگ الگ لقب سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ امام صاحب کے شیخ العرب والعجم، کعبۃ العرب، علامۃ العصر، فخر خوارزم اور صاحب الکشاف وغیرہ کئی ایک القاب ہیں۔ البتہ سب سے مشہور لقب ’’جار اللہ‘‘ ہے۔ آپ کی جائے پیدائش زمخشر اور وطن خوارزم کی وجہ سے آپ کو زمخشری اور خوارزمی کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے۔

ولادت

مؤرخین کے مطابق اقلیم خوارزم قدیم زمانہ میں ماوراء النہر کی ایک عظیم سلطنت تھی جسے چنگیز خان کی بربریت اور حملے کی وجہ سے آخر کار زوال پزیر ہونا پڑا۔ پھر اسے وہ عروج دوبارہ نصیب نہ ہوا۔ عربوں نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں اسے فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اسی خوارزم کا ایک بڑا قصبہ زمخشر تھا جہاں امام زمخشری جیسی شہرۂ آفاق ہستی پیدا ہوئی۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۲۷ رجب ۴۶۷ھ مطابق ۸ مارچ ۱۰۷۵ء بروز بدھ بیان کی جاتی ہے۔(۱)

حالاتِ زندگی

امام زمخشریؒ کی ولادت کے وقت خلافت بغداد پر خاندان سلاجقہ جلوہ افروز تھا اور سلطان ملک شاہ مسندِ خلافت پر متمکّن تھا، جس کا زمانہ سنہری دور کہلاتا ہے۔ امام زمخشری کا گھرانہ غریب

مگر متقی اور پرہیزگار تھا۔ آپ کے والد بڑے زاہد و عابد انسان تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت مراقبے، مجاہدے اور عبادتِ خداوندی میں بسر کرتے۔ بعد میں نامعلوم وجوہ کی بنا پر وہ بادشاہِ وقت کے زیرِ عتاب آ کر نظربند کر دیے گئے اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اگرچہ امام زمخشریؒ نے اپنے والد کی رہائی کے لیے بڑی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس وقت تک آپ پورے طور سے سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے۔ والد کی وفات کے وقت امام زمخشری حصولِ علم کے لیے گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے اس لیے آخری وقت ملاقات نہ ہو سکی۔ اپنے والد کی افسوس ناک موت کا امام صاحب کے دل پر بڑا اثر ہوا اور اسے آپ کبھی نہ بھول سکے۔ ’’دیوان الادب‘‘ میں امام زمخشریؒ کا اپنے والد کی موت کے متعلق ایک بڑا پُردرد مرثیہ ہے جس میں انہوں نے ان لمحاتِ فرقت کے صدمے کو بڑے پُرسوز انداز سے بیان فرمایا ہے۔

آپ کی والدہ کے متعلق بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی امام صاحبؒ کے ایامِ طفولیت ہی میں چل بسیں۔ وہ نہایت رحیم و شفیق اور رقیق القلب خاتون تھیں۔ انسانوں کے علاوہ حیوانوں پر بھی حد درجہ مہربان تھیں۔ امام صاحبؒ نے ان کی دعاؤں اور بددعاؤں کی تاثیر کا بھی اعتراف کیا ہے۔ اس ضمن میں امام زمخشریؒ سے ایک دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے(۲) کہ جب میں طفل ناداں تھا تو بطور کھیل ایک چڑیا کو پکڑ لیا اور اسے ایک دھاگے سے باندھ دیا۔ چڑیا نے آزادی اور رہائی کی بڑی کوشش کی لیکن دھاگے سے بندھے ہونے کی وجہ سے میں نے دوبارہ پکڑ لیا اور اپنے چنگے میں ڈال لیا۔ پھر اسے اس قدر بھینچا کہ اس کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا۔ جب والدہ نے دیکھا تو بڑی برہم ہوئیں اور زجر و توبیخ کرتے ہوئے فرمایا: خدا کرے تمہارا بھی پاؤں اسی طرح ٹوٹے جس طرح تم نے ایک مجبور و مقہور چڑیا کا پاؤں توڑا ہے۔ اتفاقاً ایامِ جوانی میں حصولِ علم کے لیے بخارا جاتے ہوئے سواری سے گر کر آپ کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی تو آپ نے اسے والدہ کی بددعا سے تعبیر فرمایا۔ بعض روایات میں ٹانگ ٹوٹنے کی دیگر وجوہات بھی بتائی گئی ہیں۔ ٹانگ ٹوٹنے پر جب آپ کے والد نے دیکھا کہ آپ کو چلنے پھرنے میں دقت پیش آتی ہے تو انہوں نے آپ کو سلائی کا کام سیکھنے کے لیے کہا، کیونکہ اس میں زیادہ عرصہ بیٹھنا پڑتا ہے۔ مگر امام صاحبؒ نے یہ بات نہ مانی اور کہا کہ مجھے کسی ایسی جگہ لے جائیں جہاں میں اکتسابِ علم کر سکوں۔ اس پر وہ بڑے خوش ہوئے اور آپ کو پڑھنے کے لیے دوسرے شہر چھوڑ آئے۔

تجرّد پسندی

علامہ زمخشریؒ طبعاً حساس واقع ہوئے تھے۔ آپ کی زندگی نشیب وفراز سے بھرپور تھی۔ فقروفاقہ‘ تنگ دستی‘ عسرت ودرماندگی‘ بدحالی‘ رنج ومحن‘ دردوالم اور پیہم تفکرات وغیرہ ان کی ابتدائی زندگی کا خاکہ ہیں۔ ان کی پریشان زندگی نے انہیں دنیاوی دھندوں اور بکھیڑوں سے متنفر کر دیا تھا اور وہ اپنے لیے شادی بیاہ نیز اہل وعیال کو ایک بوجھ تصور کرتے تھے۔ ان کے مطابق یہ ایک ایسا دام ہے جس میں پڑ کر انسان دینی زندگی سے غافل ہوجاتا ہے اور دنیاوی رنگینیوں میں پھنس کر اپنی منزلِ مقصود کو بھول جاتا ہے۔ علامہ کے نزدیک تعلیم وتربیت ہی بہترین پیشہ تھا اور وہ اسی کو منتہائے مقصود سمجھتے ہوئے باقی تمام مشاغل دنیوی سے پرہیز کرتے تھے۔(۳)

چنانچہ علامہ زمخشریؒ نے اپنے لیے ایک خودمختار اور آزاد عملی زندگی پسند کی اور دل ودماغ کو تعلیم وتعلّم کے واحد مشغلہ سے ہی آراستہ کیا۔ اگر علامہ کی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو ان کی شادی سے نفرت اور تجرد کے اسباب واضح ہوجاتے ہیں۔ آپ کو بچپن سے ہی مصائب وآلام سے دوچار ہونا پڑا۔ والد قید وبند کے مصائب میں مبتلا رہے اور والدہ بھی آپ کی چھوٹی عمر میں ہی انتقال کر گئیں۔ اس طرح سے آپ والدین کی شفقت ومحبت سے محروم رہے۔ اس کے علاوہ علامہ صاحب کے گھر کے دیگر افراد بھی نہایت کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسی مفلوک الحالی اور پریشان خیالی نے آپ کو ازدواجی زندگی سے بیزار کر دیا اور آپ کا دل دنیاوی معاملات سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ بہرحال اس کے بعد علامہ زمخشریؒ کے لیے علم وادب کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا جو مکمل طور سے ان کا سہارا ہوسکتا اور ان کی ازدواجی زندگی کے خلا اور محرومی کا کامل نعم البدل ثابت ہوتا۔ اب یہی ایک ایسا مشغلہ تھا جسے اپنا کر وہ اپنی زندگی میں سکون و اطمینان حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ اسی بحرِ زخار میں نیچے تک وہ خود بھی غوطہ زن ہوئے اور دوسروں کو بھی خوب سیراب کیا۔

علمی اسفار

علامہ زمخشریؒ کے دل میں علم وادب سے دلچسپی بدرجہ اتم موجود تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنے دائرۂ علم کو وسیع کرنے کے لیے مختلف مقامات کے سفر کیے۔ اس دوران اگرچہ بڑے کٹھن مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپ نے علم کا دامن آخری وقت تک نہ چھوڑا اور ”اطلبوا العلم من المھد الی

اللحد“ پر پورے اترے۔ تحصیل علم کی خاطر آپ کے سفروں کا تذکرہ مختصراً درج ذیل ہے:

(۱) سفرِ خراسان: جب علامہ غم روزگار سے تنگ آ گئے تو مجبوراً ترکِ وطن کی ٹھانی اور خراسان کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر ابوالفتح علی بن حسین سے رابطہ قائم کیا اور اپنی نحو کی کتاب ”الاغوزج“ اس کے حضور پیش کی۔ نیز اس کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہا۔ اس کے علاوہ دوسرے امرائے حکومت کی بھی مدح وستائش کی جس میں مؤید الملک اور عبیداللہ بن نظام الملک وغیرہ بھی شامل ہیں۔(۴) گویا ایک طرح سے علامہ کا یہ سفر قربِ سلطانی کی خاطر تھا اور ان کے دل میں کسی بلند منصب کے حصول کا خیال تھا۔ خراسان میں علامہ کی یہ تمنا بر نہ آئی اور انہوں نے مایوس ہو کر آگے کی راہ لی۔

(۲) سفرِ اصفہان: خراسان سے نکل کر علامہ نے اصفہان کو جائے پناہ قرار دیا۔ وہاں بھی آپ نے کسی بلند مرتبے کے لیے محمد بن ابوالفتح ملک شاہ سلجوقی کے شاندار کارہائے نمایاں کی مدح سرائی کی۔(۵)

یہ ایک طرح سے علامہ کی زندگی کا دورِ اوّل تھا جس میں آپ نے دلی تمناؤں اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بہت سے جتن کیے اور امرائے سلطنت کے قرب نیز دنیاوی مناصب کے حصول کے خواہاں ہوئے۔ لیکن جلد ہی آپ کا دل دنیاوی حرص سے اچاٹ ہوگیا اور اپنی تمام سابقہ امیدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے علامہ نے خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکات کی طرف رجوع کیا۔ اس کی محرک ایک بیماری تھی جو ۵۱۲ھ میں انہیں شدید طور سے لاحق ہوئی۔ اس بیماری نے تمنائے منصب اور آرزوئے جاہ وحشم کو نقشِ برآب کی طرح مٹا دیا اور آپ نے بیت اللہ کی زیارت کا قصد کیا۔

(۳) مکہ مکرمہ کا سفرِ اوّل: اسمعانی کی روایت کے مطابق جب علامہ زمخشریؒ کا دل دُنیاوی عیش پرستی سے بالکل اچاٹ ہوگیا تھا تو انہوں نے ٹوٹے ہوئے قصرِ امید کے ساتھ مکہ معظمہ کی طرف ہجرت کر لی اور وہاں دو سال تک مقیم رہے۔(۶) ایک جگہ علامہ خود فرماتے ہیں کہ میں وہاں تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں مشغول ہوگیا۔(۷) مکہ معظمہ کی اقامت گزینی کی وجہ سے ہی آپ کو ”جاراللہ“ کے لقب سے نوازا گیا۔

(۴) خوارزم کو واپسی: مکہ کے قیام کے بعد جب علامہ کو خوارزم کا رختِ سفر باندھنا پڑا تو

بہت غمگین ہوئے‘ کیونکہ مکہ کی محبت ان کے دل میں جاگزیں ہوگئی تھی۔ بہرحال آپ واپس خوارزم پہنچے اور وہاں قیام کیا۔ یہیں اپنے ایک قصیدے میں علامہ نے والیٔ خوارزم محمد بن انوشتگین کی علم پروری اور ادب نوازی کی تعریف کی۔ اس کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا اتسز خوارزم کا حاکم بنا تو علامہ کو اس کی بھی سرپرستی حاصل رہی اور اس کے حکم سے ہی آپ نے اپنی مشہور کتاب ’’مقدمۃ الادب‘‘ لکھی جو اتسز کے شاہی کتب خانے میں رکھی گئی۔

(۵) مکہ مکرمہ کا سفر ثانی: کچھ عرصہ وطن میں رہ کر جب مکہ معظمہ کی محبت دوبارہ بھڑکی تو علامہ زمخشریؒ مکہ کو لوٹے۔ اس مرتبہ انہوں نے شام کا راستہ اختیار کیا اور کچھ عرصہ دمشق میں بھی قیام پزیر رہے۔ یہیں آپ نے تاج الملک کی مدح کی‘ جس کو باطنی فرقے کے لوگوں نے مار ڈالا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے شمس الملک کی بھی مدح سرائی کی جو باپ کے بعد والی بنا تھا۔

دوسری مرتبہ مکہ میں تین سال قیام کیا اور اسی دوران اپنی شہرۂ آفاق تفسیر ’الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل‘ رقم فرمائی جو مختصراً الکشاف کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہیں سے آپ کا لقب ’’صاحب الکشاف‘‘ پڑا۔ یہ مشہور و معروف تفسیر ۵۲۸ھ مطابق ۱۱۳۴ء کو اختتام پزیر ہوئی تھی۔ مکہ میں دوبارہ قیام کی وجہ سے علامہ نے پھر ایک مرتبہ جاراللہ کا فخر حاصل کیا جس کے متعلق خود ارشاد فرمایا ہے:

فجاورتُ ربی وھو خیر مجاورٍ　　لدی ستر المحرم عاکفا
اقمتُ باذن اللّٰہ خمسًا　　وصارمتُ سبعًا بالمعروف واقفا
وتمر لی الکشاف ثم ببلدۃٍ　　بما ھبط التنزیل للحق کاشفا

’’میں نے معزز گھر کے قریب اعتکاف کی حالت میں اللہ کا پڑوس اپنایا اور وہ عمدہ ترین پڑوسی ہے۔ میں اللہ کی مہربانی سے وہاں مکمل پانچ سال قیام پزیر رہا اور (عوام میں مروجہ سات سال کے بعد (اپنے وطن) واپس لوٹا۔ اور میں نے اپنی (کتاب) الکشاف ایسے شہر (مکہ) میں مکمل کی جہاں حق کو کھول کر بیان کرنے والی کتاب (قرآن پاک) نازل ہوئی۔‘‘

(۶) خوارزم کو دوبارہ واپسی: آخر کار علامہ کو پھر وطن کی یاد نے ستایا اور آپ نے واپسی کا قصد کیا۔ اس مرتبہ آپ بغداد کے راستے واپس ہوئے۔ ۵۳۳ھ میں علامہ بغداد پہنچے اور ابومنصور الجوالیقی کے ہاتھوں نحو کی کتابیں پڑھیں۔ پھر خوارزم کا رخ کیا۔(۸)

اعیانِ حکومت سے تعلقات

بعض اوقات انسان یہ سمجھتا ہے کہ امراء اور وزراء سے تعلقات قائم ہونے پر اسے منصب اور شہرت نصیب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ وہ والیانِ حکومت اور شاہانِ مملکت سے تعلقات استوار کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ یہی خواہش علامہ زمخشریؒ کے دل میں بھی عنفوانِ شباب میں موجزن تھی۔ ان کے سامنے ایک بلند اور شان و شوکت سے بھرپور مقصدِ حیات تھا جس پر ان کے اعلیٰ اور شاندار مستقبل کا دارومدار تھا۔

علامہ کے استاد الضبی معتزلی تھے اور معتزلہ ہر عہد میں اپنے عقائد کی تشہیر اور نشر و اشاعت کے لیے شاہی سرپرستی حاصل کرنا ضروری خیال کرتے رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں عقائدِ معتزلہ کی تبلیغ صرف شاہی سرپرستی میں ہی ہوتی رہی ہے۔ الضبی خود بھی اسی نہج پر چلے اور اپنے شاگرد زمخشری میں بھی وہی روح پھونک دی۔ اسی سلسلے میں الضبی نے نظام الملک سے تعلقات بڑھائے ہوئے تھے اور پھر استاد کی وساطت سے خود علامہ کے تعلقات بھی نظام الملک سے استوار ہوگئے۔ یہ عہد سلجوقی کا زریں دور تھا جس میں نظام الملک بحیثیت وزیر اعظم خود بھی بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ بیک وقت علم پرور‘ ادیب و فاضل اور علماء کا قدردان تھا اور اہل علم حضرات کو حکومت میں بلند مراتب اور مناصب بھی عطا کرتا تھا۔ چنانچہ علامہ زمخشریؒ نے بھی اسی امید میں اس کی مدح سرائی کی اور کافی انعام و اکرام بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ علامہ نے ابوالفتح ملک شاہ کے دیگر امرائے حکومت و دولت سے بھی کافی تعلقات بڑھا لیے تھے اور ان میں سے اکثر کے مدحیہ قصائد کہے اور بہت کچھ انعام میں حاصل کیا۔ زیادہ مدحیہ قصائد کہنے سے علامہ صاحب کا یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ ان کے دل میں ہمدردی اور انس پیدا کر کے اپنے عقائد کے لیے جگہ پیدا کی جائے اور پھر اُن امراء اور وزراء کی مدد سے معتزلی عقائد کی عوام میں بھی تبلیغ اور تشہیر کی جائے۔

علامہ زمخشریؒ ایک بلند پایہ ادیب اور نامور عالم تھے۔ ان کی شہرت ہر چہار طرف پھیل چکی تھی اور ہر جگہ ان کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ کئی صدیاں گزرنے کے باوجود بھی ابھی تک علمی دنیا میں ان کا سکہ قائم ہے۔ اس کے باوجود انہیں اپنے شایانِ شان کوئی ایسا منصب نہ مل سکا جس پر متمکن ہو کر وہ فکرِ معاش سے آزاد ہوجاتے۔ علم اور مال کے حوالے سے حضرت علیؓ سے یہ کلام

منسوب ہے: رضینا قسمة الجبار فینا، لنا علم وللجھال مال!

اساتذہ کرام

علامہ زمخشریؒ نے حصولِ علم کے لیے کئی ایک اساتذہ سے استفادہ کیا‘ جن میں درج ذیل زیادہ اہم ہیں:

علم نحو کے ذیل میں علامہ نے سب سے زیادہ تحصیل ابومضر الضبی سے کی۔ ان پر بحیثیت استاد جس ہستی نے سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ یہی ابومضر الضبی کی شخصیت ہے۔ علامہ نے بخارا پہنچ کر ان سے لغت ونحو اور ادب کا علم حاصل کیا۔ الضبی خود بھی بہت بڑا معتزلی تھا اور اسی لیے اس نے علامہ میں بھی عقائد معتزلہ کی روح پھونک دی اور انہیں اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ بعد میں علامہ کی شخصیت پر بھی اسی استاد کا سب سے زیادہ اثر نظر آتا ہے۔ علم حدیث کے ذیل میں علامہ صاحب نے ابوالخطاب بن البطر‘ شیخ الاسلام ابومنصور نصر الحارثی اور ابوسعد الثقافی سے سماعت حدیث کی۔

علم ادب کے ذیل میں آپ نے ابوعلی الحسن بن المظفر کے پاس رہ کر نحو وادب کا استفادہ کیا۔ ابومنصور الجوالیقی سے ۵۳۳ھ میں نحو کی بعض کتابیں بغداد میں پڑھیں۔

علم اصول کے ذیل میں علامہ نے رکن الدین محمود الاصولی اور امام ابومنصور کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور شیخ السدید سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

علامہ کے تلامذہ

یوں تو علامہ زمخشریؒ کے تلامذہ کثیر تعداد میں ہیں مگر ان میں درج ذیل زیادہ مشہور ہیں:

(۱) ابوالمحاسن اسماعیل بن عبداللہ الطویل
(۲) ابوالمحاسن عبدالرحیم بن عبداللہ البزار
(۳) ابوعمرو عامر بن حسن
(۴) ابوسعد احمد بن محمود الشانی
(۵) ابوطاہر سلمان بن عبدالملک الفقیہ
(۶) محمد بن القاسم بایجوک
(۷) یعقوب بن علی بن محمد بن جعفرابویوسف بلخی
(۸) علی بن محمد بن علی بن احمد بن مروان العصرانی

(۹) الموفق بن احمد بن ابی سعید اسحاق ابوالمؤید
(۱۰) عبداللہ بن طلحہ بن محمد بن عبد اللہ الیابری
(۱۱) علی بن عیسیٰ بن حمزہ بن وھاس

مشہور کتب

علامہ زمخشریؒ نے ہر قسم کے علم وہنر کے متعلق پچاس کے لگ بھگ کتابیں لکھیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تفسیر القرآن ’الکشاف‘
(۲) الفائق فی غریب الحدیث
(۳) اطواق الذھب فی المواعظ
(۴) الرسالة الناصحه
(۵) الرائض فی الفرائض
(۶) المنہاج فی الاصول
(۷) المفصل فی النحو
(۸) جواھر اللغه
(۹) روح المسائل
(۱۰) رسالة الاسرار
(۱۱) سوائر الامثال
(۱۲) دیوان الخطب
(۱۳) شرح کتاب السیبویه
(۱۴) دیوان التمثیل
(۱۵) المفرد والمرکب فی العربیة
(۱۶) مقامات زمخشری
(۱۷) اساس البلاغة
(۱۸) مقدمة الادب
(۱۹) دیوان الادب

وفات

دنیائے ادب کا یہ تابندہ ستارہ جس کی روشنی سے ایک عالم جگمگا اٹھا اور رہنماؤں نے فائدہ اٹھایا‘ بالآخر زندگی کی منزلیں طے کرتا ہوا عرفہ کی رات ۹ ذی الحجہ ۵۳۸ھ مطابق ۱۴ جون ۱۱۴۴ء جرجانیہ کے افق پر ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔[۹]

سیرت وکردار

علامہ زمخشریؒ کے سیرت وکردار کے درج ذیل پہلو زیادہ نمایاں ہیں:

(ا) **تقویٰ:** علامہ کے خاندان کو پرہیز وتقویٰ میں ایک بلند مقام حاصل تھا اور اس گھرانے کے زہد کے تمام اہلِ زمخشر معترف تھے۔ ایسے دینی ماحول کا ہی اثر تھا کہ علامہ ایک خالص دینی رنگ

میں رنگے ہوئے تھے اور زہد وتقویٰ کے میدان میں بہت آگے نکلے ہوئے تھے۔ چنانچہ اپنے مقامات و مقالات میں بھی آپ نے عام انسانوں کو تقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ مقامات میں ایک جگہ تقویٰ کے بارے میں اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ:

''اے ابا القاسم! حیاتِ انسانی مختصر ہے۔ انسان نے اپنی زندگی کی ان مختصر ساعتوں کو بسر کرنے کے بعد خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔ اس لیے لازم نہیں کہ انسان غفلت کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھرے اور جرائم و معاصی کو اختیار کرنے سے اپنے قلب و دماغ کو گرد آلود کرتا رہے' اور اس طرح اپنے آئینہ دل کو چکنا چور کر دے۔ یاد رکھو! یہ دُنیاوی زندگی تو گمراہ کن سامان آرائش سے مزین کی گئی ہے۔ اے انسان! تو راہِ ہدایت اختیار کر اور اپنے نفس کو ان دُنیاوی بھول بھلیوں میں ڈالنے کی کوشش نہ کر' کیونکہ راہِ حق میں ہی عزت افزائی ہے۔''(۱۰)

قرآن پاک میں سورۂ آل عمران کی درج ذیل آیتوں سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝۱۴﴾

''مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوبات دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے اور چاندی کے اور نشان زدہ عمدہ نسل کے گھوڑے اور مال مویشی اور کھیتی۔ یہ سب دُنیوی زندگی کا سروسامان ہے۔ لیکن اللہ کے پاس ہے اچھا لوٹنا۔''

(ب) دنیا کی بے ثباتی: ایک اور مقام پر علامہ دنیا کی بے ثباتی کے متعلق یوں فرماتے ہیں کہ ''دنیا فقط اقبال و ادبار کی گردشوں کا نام ہے۔ زندگی میں انسان کو مختلف قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود بھی اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرے' کیونکہ زمانہ انسان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق نہیں بدل سکتا' بلکہ اپنے آپ کو ہی اس کے سانچے میں ڈھالنا چاہیے۔ نہ ہی قومیں انسانی مزاج کے مطابق عمل کرتی ہیں اور نہ ہی انسانی خواہشات کو ہو بہو پورا کیا جا سکتا ہے۔''(۱۱)

قرآن پاک میں بھی کچھ اسی طرح سورۃ الرحمٰن میں آیا ہے:﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝۲۶ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝۲۷﴾ ''جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے

والا ہے اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کی ذات جو بہت بزرگی اور بہت عظمت والا ہے''۔ علامہ صاحب کے نزدیک وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا' کیونکہ خداوند قدوس کے ہاں ہر چیز کا اندازہ پہلے سے ہی معین ہے۔

(ج) تصوف و زہد: علامہ صاحب کے سیرت و کردار میں تصوف و زہد کا بھی ایک خاص حصہ تھا۔ اگرچہ آپ کی پہلی زندگی امراء و سلاطین کے درباروں میں مدح سرائی کرتے ہوئے گزری لیکن بعد میں آپ نے ان کا قرب حاصل کرنا چھوڑ دیا تھا اور پورے طور سے عیش و عشرت سے منہ موڑ لیا تھا۔ چنانچہ آپ کی زندگی ایک نئی نہج پر چل نکلی اور اس پر دینی رنگ غالب آ گیا جس سے آپ کو شہرت و ناموری سے بیزاری ہوتی گئی۔ اب ان کے نزدیک اصل نیکی اور عبادت یہ تھی کہ انسان اپنی عبادات کو پوشیدہ رکھے اور نفس کی بے جا رغبتوں سے کنارہ کش رہے۔(۱۲)

اب وہ عشق مجازی کی بجائے عشق حقیقی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ دنیاوی محبت اور خواہشات کی پرستش میں زندگی کے لمحات کو بسر کرنا ان کے نزدیک اسے رائیگاں کرنے کے مترادف تھا۔ وہ محبت کرنے کی حق دار صرف اور صرف ذاتِ خداوندی کو سمجھتے ہیں۔ انسان کو اپنی ذات سے لو لگانی چاہیے اور یہی اپنے قلب سلیم کو نورِ ایمان اور حقیقی محبت سے لبریز کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ جب ہم خداوند کے حضور حاضر ہوں تو تہی دامن نہ ہوں بلکہ عشق الٰہی کا تحفہ ہمارے پاس ہو' تاکہ اسے دربارِ خداوندی میں مقبولیت کے لیے پیش کیا جا سکے۔(۱۳) جیسے کہ قرآن پاک کی سورۃ البقرۃ میں ہے:﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۶۵)''اور جو لوگ واقعتاً صاحب ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔''

(د) عزلت نشینی: اسی زاہدانہ زندگی کا اثر تھا کہ علامہ زمخشریؒ کی طبیعت دنیا کی محفل سے اچاٹ ہو گئی اور آپ نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ یہ گوشۂ عزلت مکہ مکرمہ میں جوارِ کعبہ یا مقامِ ابراہیم تھا' جہاں آپ کے چشمۂ فیض سے لوگ سیراب ہوتے تھے۔ آپ دنیا کی رنگینیوں کی وجہ سے یہاں کی بجائے کسی پہاڑ کی عمیق کھوہ میں رہنا پسند کرتے تھے' جہاں صرف اور صرف ذکرِ الٰہی ان کے دل کی صدائے بازگشت بن کر رہ جائے۔ ان کا تعلق ہمہ تن خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ جڑ جائے اور کان صرف اسی کے کلام کے خوگر ہو جائیں۔(۱۴) علامہ صاحب نے اپنی تصنیفات میں کئی جگہ عزلت نشینی کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ واقعی ہی دنیاوی

بکھیڑوں سے تنگ آ چکے تھے۔

(۶) صبر و قناعت: علامہ زمخشریؒ کی سیرت کا ایک بنیادی وصف صبر و قناعت تھا۔ آپ اپنے نفس کو ہمیشہ اس بات کی تلقین کرتے کہ اسے عفت و عصمت کے مزے سے باخبر ہونا اور قلیل پر اکتفا کرنے کا عادی بننا چاہیے۔ دولت کی ہوس کی بجائے قناعت زیادہ پسند کرتے تھے اور آخر میں کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے در کے سوا کسی انسانی چوکھٹ کا سائل بننا گوارا نہ کیا۔ علامہ قناعت کو ایک ایسی سلطنت تصور کرتے تھے جو تمام ہلاکتوں سے محفوظ ہوتی ہے۔ اسے ایک ایسا خزانہ سمجھتے جس میں کبھی بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک قانع انسان ہمیشہ اپنی حاجت تک پہنچنے میں قادر رہتا ہے۔(۱۵)

(و) تسلیم و رضا: یہ علامہ زمخشریؒ کی درویش منش طبیعت کا ایک طبعی جزو بن چکے تھے۔ وہ رنج و راحت دونوں حالتوں میں شکر خداوندی کرتے اور دوسروں کو بھی حکم خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی تلقین فرماتے رہتے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انسان کو تکلیف کے بعد راحت بھی ضرور ملتی ہے اور اسے مصیبت میں صبر کرنے پر اجر ملتا ہے۔(۱۶) گویا آپ قرآن پاک میں سورۃ الانشراح کی ان دو آیات پر پختہ یقین رکھتے تھے: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝﴾ ’’تو یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔ یقیناً مشکل ہی کے ساتھ آسانی ہے۔‘‘

(ز) علم کی اہمیت: علامہ زمخشری کے نزدیک علم دنیا کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ علم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کو ناپسند کرتے تھے اور سونے چاندی کے سکوں کے عوض علم فروخت کرنے کو قابل مذمت فعل گردانتے تھے۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

> ’’جو شخص اپنے علم و ادب پر فخر کرے اور اپنے علم و ادب کے باوجود بادشاہوں کے در کا سائل بنا رہے تو اس کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے۔ پھر جو شخص عالم ہونے کے باوجود اس علم سے فائدہ نہ اٹھائے اور جاہل کا جاہل بنا رہے تو اس کی مثال گدھے کی پیٹھ پر کتابوں (کے لادنے) کی مانند ہے۔‘‘(۱۷)

اس طور سے قرآن پاک کی سورۃ الجمعہ میں آیا ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

> ’’مثال اُن لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے‘ پھر وہ اس کے حامل ثابت نہ ہوئے‘ اُس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ۔ بہت بُری مثال ہے اُس قوم کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

الغرض علامہ صاحب مجسمہ اخلاقِ حسنہ اور پیکر اخلاق و مروت تھے۔ آپ کی حتی الامکان یہی کوشش ہوتی کہ ہر کام احکامِ خداوندی اور سُنّتِ محمدیہؐ کے مطابق سرانجام دیا جائے۔ چنانچہ آپ کی سوانح حیات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے فی الواقع اپنی زندگی کو اسلامی رنگ میں رنگ لیا تھا۔

علاوہ ازیں آپ کے مناقب و فضائل بہت زیادہ ہیں جنہیں اس مختصر سے مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے۔

تفسیر الکشاف پر تبصرہ

علامہ زمخشری ایک معتزلی عالم تھے اس لیے انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر میں بھی اپنے عقائد کا لحاظ رکھا اور اس کے مطابق ’الکشاف‘ لکھی۔ معتزلہ کے نزدیک درج ذیل اصولِ خمسہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں‘ اگر کسی جگہ قرآنی مطالب اور ان اصولوں کے درمیان ٹکراؤ ہوا ہے تو علامہ صاحب نے قرآن کے معانی کو اپنے اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے:

(۱) توحید: اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ عقیدہ معتزلہ کا جوہر اور روح ہے۔ اس کی رو سے معتزلہ قیامت کے روز رؤیت باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں‘ کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ کی جسمانیت اور جہت لازم آتی ہے۔ نیز ان کے مطابق صفاتِ ربانی اس کی ذات سے غیر نہیں ہیں ورنہ تعدد قدما لازم آئے گا۔ اس عقیدے پر بنیاد رکھتے ہوئے معتزلہ قرآن کو مخلوق سمجھتے تھے‘ کیونکہ وہ صفتِ کلام کو خدا تعالیٰ کی صفت قرار نہیں دیتے۔

(۲) عدل: اس سے معتزلہ یہ مراد لیتے ہیں کہ بندہ خود اپنے افعال کا خالق ہے اور خدا تعالیٰ خالق افعال نہیں ہے‘ لیکن اس میں یہ امر ملحوظ رہے کہ خدائے بزرگ و برتر کو عجز سے منزّہ رکھا جائے۔ ان کے عقیدے کے مطابق یہ چیز اس قدرت کے باعث ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ودیعت اور ان کے لیے خلق کی ہے۔ وہی ذات سب کچھ عطا کرنے والی ہے اور اسے یہ بھی قدرت حاصل ہے کہ اپنے عطا کردہ کو کسی بھی وقت سلب کر لے۔

(۳) وعد و وعید: اس عقیدے کے مطابق خدا تعالیٰ کے بیان کردہ وعد و وعید لازماً عمل میں آ کر

رہیں گے۔ ثواب کا وعدہ اور سزا کی دھمکی بھی یقیناً وقوع پزیر ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے مخلصانہ توبہ کی قبولیت کا جو مژدہ سنایا ہے وہ بھی پورا ہوگا۔ نیک کو نیکی اور بد کو بدی کی سزا لازماً مل کر رہے گی۔ کبائر گناہ بلاتوبہ معاف نہیں ہوتے اور نیکی و بدی کرنے والا اپنی جزا سے کبھی محروم نہیں رہتا۔

(۴) **المنزل بین المنزلتین:** علامہ ابوزہرہ مصری کے مطابق معتزلہ کے اس عقیدے کی بہترین تفسیر ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں یوں کی ہے[۱۸] ’’ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مرتکب کبائر مومن ہے نہ مسلم‘ لیکن ہم اس کے لیے لفظ ’مسلم‘ کا اطلاق جائز خیال کرتے ہیں تاکہ اہلِ ذمہ اور بت پرستوں سے اسے ممتاز کیا جاسکے۔ لہٰذا اب یہ لفظ مرتکب کبائر کے لیے ایسی احتیاط سے استعمال کیا جائے گا کہ اس سے اس کی تعظیم‘ ثنا اور مدح نہ سمجھی جائے‘‘۔ گویا منزل بین المنزلتین میں وہ شخص سمجھا جائے گا جو کسی کبیرہ گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے نہ تو صحیح طور پر مسلمان رہتا ہے اور نہ ہی مکمل طور سے کافر ہوجاتا ہے۔

(۵) **امر بالمعروف ونہی عن المنکر:** اس عقیدے سے معتزلہ یہ مراد لیتے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سب مومنوں پر واجب ہے تاکہ اسلام کی تبلیغ اور نشرواشاعت کا فریضہ صحیح طور سے انجام دیا جائے۔ ان لوگوں کے فکری حملوں کی روک تھام کی جائے جو حق و باطل کو آپس میں ملاتے اور مسلمانوں میں باہمی فساد برپا کرتے ہیں۔ پہلے پہل زبانی طور پر لوگوں کو گناہوں سے روکا جائے اور اگر پھر بھی وہ باز نہ آئیں تو ان پر تلوار اٹھائی جائے اور بالجبر انہیں گناہوں سے باز رکھا جائے۔

الکشاف کی ممتاز خصوصیات

الکشاف بحیثیت تفسیر درج ذیل خصوصیات کی حامل ہے:

(۱) علامہ زمخشریؒ فلسفہ‘ منطق اور فکری ریاضت سے آیتوں کے ایسے معانی پیدا کرتے ہیں جس سے اعتزالی عقائد کی تائید ہوسکے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار عقل ہے۔

(۲) علامہ قرآن کی مختلف قراءت میں سے ایسی قراءت استعمال کرتے ہیں جو ان کے عقیدے میں مددگار ثابت ہوسکے۔ اس معاملے میں وہ لغت سے بھی خاصی مدد لیتے ہیں۔

(۳) جہاں کسی آیت کی ظاہری اسناد علامہ کے عقیدے میں ممد ثابت نہیں ہوتیں‘ وہاں وہ اس آیت کو مجازی معنی پہنا کر کہتے ہیں کہ یہ آیت باب مجاز سے ہے۔

(۴) علامہ زمخشریؒ نے اسلوبِ تمثیل اور تخییل کو بھی معتزلہ کے عقیدۂ توحید کے معاون کے طور پر استعمال کیا ہے۔

(۵) علامہ نے اس تفسیر میں اپنے عقائد کی تائید میں ضعیف احادیث سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر کوئی حدیث اعتزالی عقیدے سے ٹکرائے تو وہ اس میں تاویل کی گنجائش نکال لیتے ہیں اور قرآنی الفاظ سے استعانت چاہتے ہیں۔

(۶) اپنے عقائد کی صحت کے لیے علامہ نے قدیم عربی شاعری سے بھی مدد حاصل کی ہے۔

حواشی

(۱) الزرکلی: الاعلام‘ ج۸‘ ص۵۵‘ اردو دائرہ معارف اسلامیہ‘ ج۱۰‘ ص۴۸۷

(۲) ابن خلکان‘ وفیات الاعیان‘ ج۲‘ ص۱۰۸۔

(۳) الجوینی: منہج الزمخشری‘ ص۴۳

(۴) عماد الاصفہانی: تاریخ آل سلجوق‘ ص۵۷

(۵) ابن اثیر: الکامل فی التاریخ‘ ج۱۰‘ ص۱۸۴

(۶) اسمعانی: کتاب الانساب

(۷) زمخشری: اساس البلاغۃ‘ ج۱‘ ص۷۴

(۸) ابن خلکان‘ وفیات الاعیان‘ ج۱‘ ص۳۱۴۔

(۹) الزرکلی: الاعلام‘ ج۸‘ ص۵۵‘ اردو دائرہ معارف اسلامیہ‘ ج۱۰‘ ص۴۸۷

(۱۰) زمخشری: مقامات زمخشری‘ ص۱۵ تا ۱۷

(۱۱) زمخشری: اطواق الذھب‘ مقالہ ۲۹

(۱۲) زمخشری: اطواق الذھب‘ مقالہ۶

(۱۳) زمخشری: مقامات زمخشری‘ مقامۃ الانابہ: ص۲۹

(۱۴) زمخشری: مقامات زمخشری‘ مقامات العزلہ: ص۷۱

(۱۵) زمخشری‘ مقامات زمخشری‘ مقامۃ القناعہ: ص۵۶

(۱۶) زمخشری: مقامات زمخشری‘ مقامۃ التسلیم‘ ص ۳۱

(۱۷) زمخشری: مقامات زمخشری

(۱۸) ابوزہرہ مصری: المذاھب الاسلامیۃ‘ مترجم غلام احمد حریری ❁❁

Aug 2023
Vol.72
Regd. CPL No.115
No.8
Monthly **Meesaq** Lahore

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

عرصہ 41 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد و خواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرائمر (صرف و نحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری و لُغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی
- سیرت و شمائل النبی ﷺ
- مطالعہ حدیث و اصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سالِ دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان و ادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

☆ رجسٹریشن یکم رمضان سے شروع ہے۔ ☆ انٹرویو 15 اگست
آغاز کلاسز 16 اگست 2023 (اِن شاء اللہ)

ایامِ تدریس پیر تا جمعہ

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی صرف مرد حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔
لہٰذا خواہشمند حضرات پہلے سے اپنی رجسٹریشن کروالیں۔

اوقاتِ تدریس:
صبح 8:15 بجے تا 12:50

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز —— قرآن اکیڈمی
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem.org
www.tanzeem.org

زیر انتظام مرکزی انجمن خدّام القرآن (رجسٹرڈ) لاہور
مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org
03161466611 - 04235869501-3